جولائی ۱۹۶۶ء

شعبہ جلد ۶۵

عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

یہ ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کی بات ہے

—— جب زندانوں کے دروازے کچھ اہلِ حق کے لیے کھلے

اور جماعت اسلامی کے ۶۰ رہنما جیل میں ڈال دیے گئے

—— پھر دن گزرے۔ جیل کے دن اور جیل کی راتیں

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء

تک

تذکرہ زنداں

انہی دنوں کی داستان

کراچی جیل کے ایک قیدی

—— خورشید احمد کے قلم سے ——

تذکرہ زنداں —— ایک دلچسپ حکایت ہی نہیں ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اسے آپ کے پاس ہونا ہی چاہیے۔

اُردو ادب کے حبسیاتی ادب میں ایک منفرد اضافہ۔

۳۶۰ صفحات۔ آفسٹ کی حسین طباعت۔ خوب صورت جلد

قیمت اصل ایڈیشن ۱۰/- روپے —— سستا ایڈیشن ۶/- روپے

سول ایجنٹ:۔ **اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور**

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۵	جولائی ۱۹۶۶ء	جلد ۶۵

چندہ سالانہ	دفتر ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

بھلے آدمی کی نشانی یہ نہیں ہے کہ اُس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہی نہ ہُوا ہو۔ اسی طرح بُرے آدمی کی پہچان بھی یہ نہیں ہے کہ اُس کے ہاتھ سے زندگی بھر کبھی نیکی اور بھلائی کا کام سرانجام نہ پایا ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ بھلے آدمی سے کوئی سنگین گناہ سرزد ہو جائے اور اسی طرح یہ بات بھی غیر ممکنات میں سے نہیں ہے کہ ایک انتہائی بُرا آدمی کبھی کوئی غیر معمولی نیکی اور بھلائی کا کام کر گزرے۔ کسی شخص کے نیک یا بد ہونے کا انحصار ایک آدھ فعل پر نہیں ہوتا بلکہ اُس رجحان اور میلانِ طبع پر ہوتا ہے جس کے مطابق وہ اپنے لیے ایک مخصوص اندازِ زیست اور اسلوبِ حیات متعین کرتا ہے۔ ایک نیک آدمی شعوری طور پر بھلائی کے لیے کوشاں رہتا ہے، عزم و ہمت کے ساتھ بُرائی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اُس سے بُرائی کا کوئی کام سرزد ہو جائے تو اس کے دل میں ندامت کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ زیادہ عزم اور مضبوط ارادے کے ساتھ بُرائی سے بچنے اور بھلائی اختیار کرنے کی فکر کرتا ہے۔ بخلاف اس کے بُرے آدمی سے اتفاقاً یا ارادۃً کوئی نیکی صادر ہو سکتی ہے مگر اس کا عام رجحان بُرائی ہی کی طرف ہوتا ہے اور یہی چیز اسے بُرا انسان بناتی ہے۔

انسانی زندگی میں اصل اور فیصلہ کُن اہمیت اِکّا دُکّا کاموں کی نہیں ہوتی بلکہ اُس اندازِ فکر کی ہوتی ہے جو کسی فرد کے افعال و اعمال کا سرچشمہ ہے۔

یہی صورتِ حال ہمیں اقوام کے معاملے میں ملتی ہے۔ کسی قوم کے اساسی تصورات کا اندازہ

اُس کے کسی ایک کام سے نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اُس طرزِ فکر سے لگایا جاتا ہے جس کی وہ علمبردار بن کر اپنی خارجی اور داخلی پالیسی کے رُخ متعین کرتی ہے اور جس کے تحت اس کی ساری سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔

امریکہ اور انگلستان سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار ہیں اور اسی نظام کی توسیع و ترقی کے لیے وہ زندہ اور کوشاں ہیں۔ اُن کی سعی و جہد کا مقصود اسی نظامِ سرمایہ داری کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچانا ہے۔ ان کے ہاں اگر کسی معاملے میں عام انداز سے ہٹ کر کوئی دوسرا انداز اختیار کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد بھی بالواسطہ اسی نظام کی خدمت اور چاکری ہوتا ہے۔ یہی حال اشتراکی ممالک کا اپنے نظامِ اشتراکیت کے معاملہ میں ہے۔ وہ بھی ایک خاص نصب العین کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ اُن کی ساری کوششیں اشتراکیت کے مقاصد کو حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہیں۔ اپنے عوام کی صلاحیتوں اور اپنے ملکی وسائل کو صرف اسی ایک متعین راہ پر لگا دینے ہی میں وہ اپنی کامیابی اور کامرانی کا راز پاتے ہیں۔ اس ایک راہ سے ہٹ کر وہ بالقصد ایک قدم بھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور اگر کبھی نادانستہ اُن سے اس قسم کی کوئی حرکت سرزد ہو جائے تو اُن میں سے ہر فرد شدید کرب محسوس کرتا ہے یہاں تک کہ پوری اشتراکی جماعت اس کے ازالے کے لیے فکرمند ہو جاتی ہے۔

نصب العین کا تعین اور اُس کی محبت اور پھر اس کے حصول کے لیے سچی تڑپ اور لگن نہ صرف کسی فرد اور قوم کی صلاحیتوں کو بیدار کرتی اور انہیں مجتمع کر کے ایک خاص راہ پر لگانے کا عزم اور ولولہ پیدا کرتی ہے بلکہ اس کے شعور کو پختگی اور احساس کو گہرائی بھی عطا کرتی ہے کسی فرد یا قوم کو اپنے مقصدِ حیات سے جتنی زیادہ گہری وابستگی ہوگی اتنا ہی زیادہ اُس کے اندر یہ ارادہ پیدا ہوگا کہ وہ اپنی قوتوں اور اپنے وسائل کو زیادہ سے زیادہ اسی ایک مقصد کے حصول میں صرف کرے۔ جس شخص کی منزلِ مقصود متعین ہو اور وہ اس تک پہنچنے کے لیے سچی آرزو اور

امنگ بھی رکھتا ہو وہ آخر جان بوجھ کر اپنے وقت اور اپنی قوت کو آوارہ گھومنے میں کس طرح گنوا سکتا ہے۔ وہ تو قدرتی طور پر اس بات کا فکر مند رہے گا کہ جلد از جلد قدم اٹھا کر منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔ اس راہ میں اُس کا ایک قدم بھی غلط اُٹھ جائے تو اُسے سخت اذیت ہو گی۔

ہر حساس اور باشعور فرد اور ہر زندہ اور باغیرت قوم سے اپنے نصب العین کے ساتھ اسی وابستگی کا اظہار ہوا کرتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مقصدِ حیات کے ساتھ سچی محبت اور اس کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ اور قربانی ہی کسی فرد یا قوم کی حیات ہے تو یہ زیادہ صحیح ہو گا۔ اِس بدیہی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اپنے ملک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔

پُوری دنیا اس حقیقت سے واقف ہے کہ پاکستان کا محرک کوئی وطنی جذبہ یا معاشی اور اقتصادی مفاد نہ تھا بلکہ اس تحریک کے پیچھے سرزمینِ ہند کی مسلمان قوم صرف اِس احساس کی بنا پر لگ گئی تھی کہ ہم مسلمان ہونے کے تقاضوں کو اس وقت تک کما حقہٗ پُورا نہیں کر سکتے جب تک ہماری اجتماعی زندگی کا نظام دینِ حق کے تابع نہ ہو، اور یہ چیز صرف ایک ایسی آزاد مملکت ہی میں میسّر آسکتی ہے جس کی سیاست، معیشت، معاشرت اور روحانیت کا مبداء اور اساس اسلام ہو۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ اسلام چونکہ خود ایک انقلاب انگیز تحریکِ فکر و عمل ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے اس لیے وہ کسی دوسری تہذیب کی تابع رہ کر پنپ نہیں سکتی۔ یہ آزاد فضا ہی میں پُوری طرح برگ و بار لاتی ہے۔ اس لیے جن علاقوں میں ہماری اکثریت ہے ان میں ہمیں یہ اختیار ملنا چاہیے کہ ہم زندگی کے جس لائحہ عمل پر ایمان رکھتے ہیں اسے کسی مزاحمت کے بغیر نافذ کر سکیں۔

ملک کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد کسی صاحبِ اختیار کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ یہ خطۂ ارضی اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے بجائے لادینی نظریات کو فروغ دینے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ جو لوگ بھی آج تک مختلف اوقات میں اقتدار کے تخت پر متمکن ہوئے ہیں ان کے دلوں میں خواہ کچھ

ہی ہو، زبان کی حد تک انہوں نے اِس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے کہ پاکستان کے قیام کا مقصد صرف اسلامی نظام کا احیاء ہے۔ یہ حقیقت اتنی بدیہی، اتنی ناقابلِ تردید اور اتنی واضح ہے کہ اسے ملکی دستور میں بھی پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے۔ گذشتہ ۱۸ برسوں میں یہاں عجیب و غریب انقلابات آتے رہے ہیں اور مختلف شخصیتیں مختلف عزائم اور نظریات لے کر اُبھرتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض افراد ایسے بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی طاقت اور قوت کے زعم میں پوری قوم کی رائے کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے بالکل مطلق العنان ہو کر جو چاہا کیا۔ لیکن وہ بھی یہ بات کہنے کی جرأت نہ کر سکے کہ پاکستان کو اسلام کا نہیں بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بننا چاہیے۔

ان حقائق کو دیکھتے ہوئے انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کا عین وجود جس نظریے کا رہینِ منت ہے، جو اس کے دستور اور آئین میں بطورِ بنیاد شامل ہے۔ جو پاکستانی عوام کے دلوں کی دھڑکن بن کر دھڑک رہا ہے، جس کی تابندہ روایات ملک کی عظیم اکثریت کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں، جس کے ذکر سے آج بھی لوگوں کے افسردہ چہروں پر رونق آجاتی ہے، اور جس پر آنچ آتی نظر آئے تو وہ اس کی حفاظت کی خاطر ہر قربانی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، وہ آخر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کارفرما کیوں نہیں ہوتا۔

اس کا جواب بالکل واضح ہے جو لوگ ہمارے افراد کی تعلیم و تربیت، اور ہماری اجتماعی زندگی کی تشکیل کے براہِ راست ذمہ دار ہیں انہوں نے اس نظریہ کو دل و جان سے قبول نہیں کیا وہ چونکہ اس نظریے کے بارے میں قومی احساسات سے پوری طرح باخبر ہیں اس لیے وہ زبان سے تو اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کرتے۔ اور جہاں قوم کے جذبات سے کھیلنا مقصود ہوتا ہے وہاں اسے ایک مفید اور کارگر ہتھیار کے طور پر بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال بھی کر لیتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اس نظریہ کی غیر معمولی اہمیت اور افادیت کو دل کی گہرائیوں سے کبھی تسلیم نہیں کیا، ورنہ وہ اس کے متعلق لاپروائی کا وہ رویّہ اختیار نہ کرتے

جس کے واضح مظاہر ہم قدم قدم پر دیکھتے ہیں۔

اِس حقیقت کو جاننے کے لیے کسی گہری سوچ بچار یا غیر معمولی تفکر و تدبر کی ضرورت نہیں بلکہ روزمرّہ کے واقعات اس کی پوری طرح شہادت دیتے ہیں۔ آپ صرف اس ماہ کے چند واقعات پر نظر ڈالیں تو آپ پر حقیقتِ حال پوری طرح منکشف ہو جائے گی۔

کون شخص اس بات سے ناواقف ہے کہ جس طرح چہرہ دل کا آئینہ ہے بالکل اسی طرح کسی قوم کا میزانیہ (بجٹ) اس قوم کے عزائم اور اُس کی امنگوں کا شارح اور ترجمان ہوتا ہے۔ میزانیہ کو دیکھ کر اس بات کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس قوم کے پیشِ نظر کون سے مقاصد ہیں وہ اُسے کس قدر عزیز ہیں، کس انداز پر وہ ان کے حصول کے لیے اپنے وسائل خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اس معاملے میں وہ کتنے ایثار سے کام لینے پر آمادہ ہے۔ اب اگر آپ ۶۷-۱۹۶۶ء کے بجٹ کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیں تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی اور آپ محسوس کریں گے کہ یہ میزانیہ کسی ایسی قوم کا نہیں ہے جو خیر و شر کے واضح تصورات، خوب و ناخوب کے اپنے مخصوص پیمانے اور انسانوں کے باہمی روابط کا ایک خاص انداز رکھنے کی وجہ سے دوسری قوموں سے ممیّز اور ممتاز ہے۔ مرکزی اور صوبائی دونوں میزانیوں میں کوئی مد بھی ایسی نہیں جس سے اس بات کا معمولی اشارہ بھی ملتا ہو کہ یہ قوم کسی اخلاقی اور دینی نظام کی حامل ہے اور معاشی تگ و دو کا اپنا ایک مخصوص تصور رکھتی ہے۔

یہ میزانیے نظامِ سرمایہ داری کے پوری طرح عکاس ہیں اور اس بات کی کھلی غمازی کرتے ہیں کہ ایک قوم اسلام کے ضابطۂ حیات اور اس کی اخلاقی اقدار سے یکسر بے نیاز ہو کر اس طریق سے سرمایہ اندازی (CAPITAL FORMATION) کے لیے مختلف منصوبے بنا رہی ہے جس سے دولت صرف چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور بندۂ مزدور کے اوقات تلخ سے تلخ تر ہوتے چلے جائیں تاکہ اُس کے سارے اوقات، اُس کی ساری خداداد صلاحیتیں فکر

معاش کی نذر ہوجائیں ۔

مرکزی وزیرِ خزانہ جناب محمد شعیب صاحب نے پاکستان کی معاشی ترقی کا بڑے طمطراق سے تذکرہ کیا ہے اور اعداد و شمار کی شعبدہ بازی سے حقیقتِ حال چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ مارشل لا کے بعد حکومت نے مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ اپنی آمدنی کو ۲۵۰ فیصد بڑھا لیا ہے مگر اس کے مقابلے میں مجموعی قومی پیداوار (GROSS NATIONAL PRODUCT) میں صرف تیس فیصد سے لے کر ۴۰ فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ چونکہ حکومت کی بیشتر آمدنی (تقریباً ۷۵ فیصد) کا دارومدار بالواسطہ محصولات (INDIRECT TAXES) مثلاً کسٹم ڈیوٹی، مرکزی آبکاری ٹیکس اور محصول فروخت پر ہے اس لیے ۲۵۰ فیصد بڑھے ہوئے اخراجات کا زیادہ تر بوجھ طبقۂ امراء کے بجائے طبقۂ غرباء کو اٹھانا پڑتا ہے جو اپنی ناگزیر ضروریات حاصل کرنے کے لیے اپنی آمدنی کا بیشتر حصّہ ٹیکس کی صورت میں حکومت کے حوالے کر دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ بیانات اور تقریروں میں قوم کو یہ مژدہ جانفزا سنایا جاتا ہے کہ پاکستان کو جلد از جلد ایک فلاحی مملکت میں تبدیل کیا جائے گا۔ لیکن اس فلاحی مملکت کا جو ابتدائی نقشہ ان جھٹ میں ابھر کر ہمارے سامنے آتا ہے اُس میں تو عوام کوئی دلکشی محسوس نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی عجیب و غریب فلاحی مملکت تیار ہو رہی ہے جس میں غریب دن بدن غریب تر ہوتے جائیں گے اور دولت چند ہاتھوں میں سمٹتی چلی جائے گی۔ دولت کی عادلانہ تقسیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ طبقۂ امرا اور طبقۂ غرباء کے درمیان جو غیر معمولی تفاوت پایا جاتا ہے اُسے حتی المقدور ختم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ قوم کے سارے طبقات ایک بہتر اور شادکام زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن اس "فلاحی مملکت" کا نظامِ محاصل طبقۂ امراء کے کندھوں سے بوجھ ہلکا کر کے اُن کمزوروں کی پشت پر لاد رہا ہے جن کی کمر پہلے ہی سے بوجھ تلے ٹوٹ رہی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ بالواسطہ محصولات جن کی بیشتر زد طبقۂ غرباء پر پڑتی ہے ان میں کتنا غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

گذشتہ دس سالوں میں مرکزی آبکاری محصول ۵۲۰ فیصد اور محصول فروخت ۳۶۰ فیصد بڑھا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں انکم ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس جو براہ راست محصول ہونے کی وجہ سے طبقۂ امراء سے وصول کیے جاتے ہیں ان میں اضافہ کی شرح ۲۱۷ فیصد ہے پھر صنعت کاروں اور تاجروں کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے اس ٹیکس میں مزید رعایت دی جاتی ہے اور انہیں دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹنے کے بے شمار مواقع فراہم کیے جارہے ہیں۔ اس افسوسناک صورت حال کا اس سال کے مرکزی میزانیہ سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وزیر خزانہ صاحب نے جن اشیاء کی شرح محصول میں اضافہ کا اعلان کیا ہے مثلاً سوتی کپڑا، سیمنٹ، پٹرول، تیل، سوڈا ایش، یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں اور ایک غریب انسان اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ پہلے ہی ان پر صرف کر رہا تھا۔ اب ٹیکس میں اضافے کی وجہ سے ان کی قیمتیں مزید بڑھ جائیں گی اور اس طرح غرباء پر عرصۂ حیات اور بھی تنگ ہو جائے گا۔

صوبائی میزانیہ بھی اسی سرمایہ دارانہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے اور اس میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو اس بات کی شہادت دے سکے کہ اس ملک کے حکمرانوں کی نظر میں اسلام بھی کسی اہمیت کا حامل ہے اور اللہ کے دین کے بھی کچھ تقاضے ہیں جنہیں اصحاب اقتدار کو بحیثیت مسلمان اور بحیثیت حکمران پورا کرنا چاہیے۔ جس دستور کی وفاداری کا حلف اٹھا کر وہ اقتدار کے تخت پر متمکن ہوتے ہیں اس کی رو سے یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اسلام کے اصولوں کو عملی جامہ پہنائیں اور مسلمانوں کو اس کے مطابق انفرادی و اجتماعی زندگی گزارنے کے قابل بنائیں۔ لیکن واقعات کی دنیا میں جو کچھ کیا جارہا ہے وہ اس مقدس ارادے کے بالکل برعکس ہے۔

اسلام کے نزدیک سود جس نوعیت کی سنگین برائی ہے وہ کسی صاحب علم سے مخفی نہیں۔ اس بنا پر ارباب بست و کشاد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس لعنت کو ملک سے جلد از جلد ختم کریں۔ دین و ایمان سے ان کی وابستگی اور ملکی دستور سے ان کی وفاداری

دونوں اس بات کی متقاضی ہیں کہ قوم کو اس بُرائی کے چنگل سے نجات دلائی جائے لیکن دیکھیے یہاں عملاً کیا ہو رہا ہے۔ صوبائی وزیر خزانہ نے خود ایوان کے اندر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ صوبائی حکومت پر قرضوں کا بوجھ برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت مغربی صوبے کے عوام بارہ ہزار کروڑ کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔[1] وزیر خزانہ صاحب نے مغربی پاکستان کی آبادی پانچ کروڑ بتائی ہے۔ اب اگر اس آبادی پر قرضوں کے بار کو تقسیم کیا جائے تو خطۂ پاک کے دائیں بازو میں ہر فرد چوبیس سو روپے (۲۴۰۰) کے قرض کا بار اٹھائے زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایک اوسط خاندان جو پانچ افراد یعنی میاں، بیوی اور تین چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر مشتمل ہو وہ بارہ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ اور یہ قرض بھی کوئی قرضِ حسنہ نہیں بلکہ ایسا قرض ہے جس پر اُسے سود کی ایک بھاری شرح عائد کرنی پڑتی ہے۔

شراب نوشی اسلام میں کتنا گھناؤنا فعل ہے، وہ کسی مسلمان سے تو کیا کسی غیر مسلم سے بھی پوشیدہ نہیں۔ باری تعالیٰ نے اسے عملِ شیطان سے تعبیر فرمایا ہے اور حضور سرورِ دو عالم ؐ نے اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کرنے والوں پر حد جاری کی ہے۔ اگر یہاں اللہ کے دین کا کچھ پاس ہوتا تو اس لعنت کی بیخ کنی کی جاتی۔ یہ بُرائی ابھی تک سوسائٹی کے نہایت اونچے، آزاد طبع اور مغرب زدہ طبقے تک محدود ہے یا انتہائی گھٹیا قسم کے اوباش اور بدمعاش لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ عام مسلم معاشرہ ابھی اس کی زد سے محفوظ ہے۔ ان حالات میں اس کا قلع قمع کچھ مشکل نہیں لیکن حکومت اس کے خاتمہ کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانے کے بجائے اندرونِ ملک میں اس کی تیاری کی اجازت اور بیرونِ ملک سے درآمد کے لائسنس دیتی ہے اور جو بدبخت اس کے رسیا ہیں انہیں اس سے روکنے کے بجائے اس کے استعمال کے لیے اجازت نامے جاری کرتی ہے تاکہ وہ اس حرام شے کو دھڑلے سے استعمال کر کے خود بھی برباد ہوں اور معاشرے کی بربادی کا سامان بھی پیدا کریں۔

---

[1] بحوالہ "امروز" ۱۵ جون ۱۹۶۶ء

صوبائی وزیر خزانہ نے اسمبلی کے ارکان کے سامنے اس لعنت کے متعلق جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ اٹھارہ ماہ کے عرصہ میں صرف مغربی صوبے کے لیے ۴۳½ لاکھ گیلن شراب درآمد کی گئی ہے اور ۹ لاکھ ۲۰ ہزار گیلن مغربی پاکستان میں تیار ہوئی ہے۔ ایک معزز رکن کے سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر خزانہ نے یہ بھی انکشاف فرمایا کہ یکم جولائی ۱۹۶۳ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء تک پونے چار سال کے عرصہ میں راولپنڈی، لاہور اور کراچی میں تیرہ لاکھ باون ہزار سات سو ایک گیلن شراب استعمال کی گئی اور سالِ رواں میں صرف لاہور کے دو ہزار آٹھ سو چھپن مسلمانوں کو شراب پینے کے پرمٹ جاری کیے گئے[1]

آپ خود ہی غور فرمائیں کہ کیا یہ طرزِ عمل کوئی ایسا طبقہ اختیار کر سکتا ہے جس کے دل میں اسلام، اُس کی روایات اور اُس کی تعلیمات کا کچھ بھی احترام ہو؟ شراب دینی، اخلاقی، طبی، معاشرتی اور معاشی نقطۂ نظر سے ایک بڑی بُرائی ہے۔ یہ ام الخبائث جب کسی قوم کے اندر راہ پاتی ہے تو اُسے برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس بُرائی کی روک تھام کرنے کے بجائے اسے اندرونِ ملک تیار کروا کر اور دوسرے ممالک سے درآمد کر کے اُن آبرو باختہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے جن کو اس کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ عیاش اور بد اخلاق لوگوں کے ساتھ تو اس فیاضی کا سلوک کیا جاتا ہے اور ان کی عیاشیوں کے لیے نہایت قیمتی زرِ مبادلہ، جس کی ایک ایک پائی کی ہمیں اشد ضرورت ہے، صرف کرنے میں قطعاً تامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن جب اسلام کے بنیادی فریضۂ حج کی ادائیگی کا سوال پیدا ہوتا ہے اور عوام اس کے لیے بیتابی کا اظہار کرتے ہیں تو اُن کے اس جائز دینی مطالبہ کو مسترد کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ زرِ مبادلہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ زیادہ افراد کو حج بیت اللہ کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ اس غلط طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ بھارت سے جو ایک لادینی ریاست ہے اور جس نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے اور جہاں مسلمانوں کی آبادی پانچ چھ کروڑ

---

[1] نوائے وقت ۱۰ر جون ۱۹۶۶ء

سے زیادہ نہیں، اس سال پاکستان کے مقابلے میں چار گنے زیادہ حاجی آئے۔

دونوں میزانیوں کی مدات خرچ پر بھی نگاہ ڈالیے اور اندازہ کیجیے کہ اس ملک کی کتنی دولت مفید اور کارآمد کاموں میں خرچ ہوتی ہے اور اس کا کتنا حصہ بیکار کاموں کی نذر ہو رہا ہے۔ لاکھوں روپے سالانہ کے صرف سے متعدد ایسے ادارے چلائے جا رہے ہیں جن کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ اسلام کے معاملے میں عوام کے اندر فکری انتشار پیدا کریں۔ آرٹ اور کلچر کی مختلف تنظیموں کو جن کی سرگرمیوں کے خلاف پورا ملک احتجاج کرتا ہے، عوامی احساسات کو پس پشت ڈالتے ہوئے بڑی فیاضی کے ساتھ مالی امداد دی جاتی ہے۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کی رقم ایسے پروگراموں کی تکمیل کے لیے صرف کی جا رہی ہے جنہوں نے مغرب کے اخلاق کا جنازہ نکال دیا ہے اور جن کے خطرناک نتائج اس سُرعت کے ساتھ کھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں کہ حساس اور فرض شناس لوگوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں اور وہ دل گرفتہ ہو کر سوچ رہے ہیں کہ یا الٰہی یہ ملک کن عجیب اور خوفناک راہوں پر چل نکلا ہے۔ مگر حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی اور ان پر بے دریغ روپیہ صرف کرتی چلی جاتی ہے اور خزانہ پر قطعاً کوئی بار محسوس نہیں کرتی لیکن جب اُس سے کوئی شخص یہ دریافت کرتا ہے کہ حالیہ پاک بھارت جنگ کے دوران لاہور اور سیالکوٹ میں جن ۴۸ مساجد کو نقصان پہنچا ہے، کیا حکومت اُن کی مرمت کے بارے میں کسی طرح فکرمند ہے تو اُس کا ایک نمائندہ اسمبلی کے اندر صاف طور پر سرکاری پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے[1] "مساجد نہ حکومت نے تعمیر کرائی ہیں اور نہ وہ ان کی مرمت کی ذمہ دار ہے۔ یہ کام مخیر حضرات اور سیاسی جماعتوں کو سرانجام دینا چاہیے"۔ یہ مختصر سا ارشاد اسلام کے بارے میں حکومت کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی پوری طرح غمازی کرتا ہے۔ حکومت مساجد کی تعمیر کے معاملے میں تو کوئی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں مگر ضبطِ ولادت جو معاشی مسئلے سے کہیں زیادہ اخلاقی مسئلہ ہے اور جس کی زد مسلمانوں کے اعتقاد یعنی باری تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت

[1] نوائے وقت ۲۳ جون ۱۹۶۶ء

پر پڑتی ہے، اُسے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے حکومت بیتاب ہے اور اس پر زرِ کثیر خرچ کر رہی ہے۔ حالانکہ ہمارے ہاں جن ممالک کی تقلید میں یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے اُن کی حکومتیں لادینی ہونے کے باوجود عوام کے مذہبی احساسات کا اس قدر احترام کرتی ہیں کہ ضبطِ ولادت کی اس تحریک کو فروغ دینے کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانے سے وہ محض بعض عیسائی فرقوں، خصوصاً رومن کیتھولک فرقے کے جذبات کی پاسداری کی خاطر ہمیشہ گریز کرتی رہی ہیں اور انہوں نے اس مہم میں براہِ راست شریک ہونا کبھی پسند نہیں کیا۔

مساجد کی تعمیر میں یہ بے نیازی اور ضبطِ ولادت جیسی اخلاق سوز تحریک کے پھیلانے میں یہ سرگرمی کیا حکومت کے رجحانات کی عکاسی نہیں کرتی ؟

اللہ تعالیٰ کو کسی نے دیکھا نہیں بلکہ اُس ذاتِ برحق کو اُس کی نشانیوں سے پہچانا ہے۔ ایمان چونکہ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے کسی شخص کی ایمانی حالت کا فیصلہ کسی محسوس معیار کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قلبی لگاؤ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سچّی محبت، اس کی تعلیمات سے وابستگی اور اُن کی اطاعت کا جذبۂ صادق، یہ سب ایمانی کیفیات انسان کے طرزِ فکر، اور اُس کے طرزِ عمل میں ضرور منعکس ہوتی ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص کو اللہ کے دین سے گہری محبت بھی ہو اور وہ جان بوجھ کر ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت ایسی تدابیر اختیار کرے جن سے دین کی تخریب کا خطرہ ہو، یا وہ اسلام دشمن قوتوں کا محاسبہ کرنے اور ان کا راستہ روکنے کے بجائے الٹے اُن کی تائید کرنے لگے۔

ہمارے ہاں اس وقت اسلام کے بارے میں حکومت نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ کسی ایسی حکومت کو زیب نہیں دیتا جس نے اسلام کو اپنے دستور اور آئین کا بنیادی پتھر قرار دیا ہو۔ اربابِ اختیار کے اپنے بارے میں تو جذبات اس قدر نازک ہیں کہ جہاں کسی نے اُن کی کسی پالیسی یا طرزِ فکر سے اختلاف کیا وہیں جبینیں شکن آلود ہو گئیں اور تنقید کرنے والے کو اُن کی اس

بے جا جسارت کی سزا دینے کے لیے پوری سرکاری مشینری حرکت میں آ گئی۔ مگر اسلام کے خلاف یہاں جس کا جو جی چاہے کہتا رہے اُس سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ اسلام کے بارے میں حکومت کی بے حسی کا حال یہ ہے کہ وہ اگر خود بھی کوئی قدم صحیح سمت میں اٹھاتی ہے تو اس پر اُس کا دل نہیں جمتا اور اپنے کیے ہوئے فیصلے کو نہ تو مؤثر طریق سے عملی جامہ پہناتی ہے اور نہ اس کے حق میں ٹھوس اور واضح دلائل دے کر مخالفین کو خاموش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات عوامی دباؤ سے مجبور ہو کر کوئی ایسا اعلان جاری کر دیتی ہے جس پر لوگوں کو قدرے اطمینان ہوتا ہے اور وہ اسے ایک مفید قدم سمجھ کر اس کی پزیرائی کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ اعلان یا تو اخبارات کی زینت بنتا ہے یا گشتی مراسلوں کی صورت میں دفتری فائلوں میں دب کر رہ جاتا ہے۔ عملی زندگی میں اس کے مطابق قطعاً کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی۔ زندگی کی جوئے رواں جوں کی توں جاری رہتی ہے۔ تجدد پسند اور بے دین طبقے اس کے خلاف کھل کر بے سرو پا باتیں کرتے ہیں مگر حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی اور وہ ان ساری باتوں کو اس خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی ہے جیسے کہ وہ اس سارے ڈرامے کی خاموش تماشائی ہے اور اس کا خود اپنے اس فیصلے سے کوئی دُور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ ابھی چند ہی روز کا واقعہ ہے کہ حکومت مغربی پاکستان نے تعلیمی اداروں میں ناچ گانے کی خرافات پر پابندی عائد کی اور ملک بھر میں حکومت کے اس اقدام کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس اعلان کو سنتے ہی تجدد پسند اور ثقافت گزیدہ عناصر سخت برہم ہوئے اور انہوں نے اس کے خلاف اخبارات میں باقاعدہ ایک مہم شروع کر دی جس میں پیش پیش خود حکومت کے اپنے منظورِ نظر اخبارات ہیں۔ ان کے کالموں میں کبھی کسی بگڑے ہوئے مسلمان بادشاہ کو بطور مثال پیش کر کے رقص و سرود کی حمایت میں مضامین لکھے گئے اور کبھی یہ بھونڈی دلیل دی جانے لگی کہ اگر مغربی پاکستان کے سکولوں اور کالجوں میں ناچ گانے کا پرچم سرنگوں ہو گیا تو مشرقی پاکستان سے قومی وحدت کے رشتے کمزور ہو جائیں گے۔ گویا مغربی اور مشرقی پاکستان اور میں اگر کوئی قدر مشترک ہے تو وہ ناچ گانے کا جنون ہے۔

اس کے سوا ان میں اخوت کا کوئی دوسرا رشتہ موجود نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب حکومت نے اس معاملے میں ایک مستحسن قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے فیصلے کو پوری قوم کی تائید بھی حاصل ہے تو کیا اس کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ اسے جلد از جلد نافذ کرنے کی کوشش کرتی اور نشر و اشاعت کے سارے ذرائع استعمال کر کے گنتی کے اُن چند لوگوں کا مسکت جواب دیتی جو اس معاملے میں انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں حال یہ ہے کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات میں جن پر حکومت کا براہِ راست قبضہ ہے اس فیصلے کے خلاف بڑے دل آزار خطوط اور مضامین شائع ہو رہے ہیں اور ان سے کوئی باز پُرس نہیں کی جاتی، حالانکہ حکومت کی مرضی کے خلاف ایک لفظ لکھنے کی بھی وہ جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر یہ اخبارات غیر متوازن اور غیر حقیقت پسندانہ میزانیوں کے حق میں حکومت کے ایما پر لمبے لمبے اداریئے لکھ سکتے ہیں تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس صحیح فیصلے کے حق میں لکھنے کے لیے ان اخبارات کے صفحات میں کیوں گنجائش نہیں نکلتی اور اس کے خلاف طعن و تشنیع سے بھرا ہوا مواد وہ کیسے شائع کرتے ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ اسے حکومت کی رواداری اور وسیع المشربی سمجھیں۔ لیکن یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اگر حکومت یہ سب کچھ اپنی وسیع الظرفی کی وجہ سے گوارا کر رہی ہے تو پھر اُسے اپنے سیاسی حریفوں اور اپنے طرزِ عمل سے اختلاف کرنے کے ساتھ بھی اِسی فیاضی اور بُردباری کا ثبوت دینا چاہیے۔ اسلام کے معاملے میں تو وہ اتنی روادار ہے، مگر خود اپنے معاملہ میں اس کا حال یہ ہے کہ کوئی معمولی سی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتی اور اُن لوگوں کی آزادی سلب کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے کسی قول یا فعل پر گرفت کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

اس ملک کے عوام اور اس کے اربابِ اختیار کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ باری تعالیٰ بڑا غیرت مند ہے۔ وہ اپنے دین کو دنیا پرستوں کے ہاتھ میں کبھی کھلونا بنانا گوارا نہیں کرتا۔ قرآن حکیم، سنتِ نبوی اور تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ اُس نے

کمزور سے کمزور انسانوں کو جو ہر طرح کے مالی وسائل سے محروم تھے، خدمتِ دین کا اعزاز بخشا لیکن اُس علیم و خبیر اور غیور ذات نے کبھی دین کے نام پر کھوٹے سکوں کو چلنے نہیں دیا۔ اُس ذات بے ہمتا نے کمزوری، بے کسی، وسائل سے محرومی، غرض مال و متاع کی ہر کمی کو اپنی رحمتِ خاص سے پورا کر کے اُن لوگوں کے ہاتھوں دین کی سربلندی کا سامان کیا جو دنیا میں حقیر سمجھے جاتے تھے اور پھر دنیا اور آخرت دونوں میں انہیں سرفراز فرمایا، لیکن اُس نے اُن لوگوں کو کبھی پنپنے کا موقع نہیں دیا جنہوں نے دین کے نام پر دنیا کی تجارت کی اور اسے محض ترقی اور اقتدار کے حصول کے لیے بطور ذریعہ استعمال کرنے کی ناپاک جسارت کی۔

اخبار بیں حضرات اور اُن کی وساطت سے یہ بات غالباً پاکستان کے ہر فرد تک پہنچ چکی ہوگی کہ امیر جماعت اسلامی پاکستان، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے صوبائی وزیر اوقاف جناب حبیب اللہ خاں کے بیان کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ہم جنگ سے تباہ شدہ مساجد کی تعمیر اور مرمت کو اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتے ہوئے اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس بزرگ و برتر ذات نے ہمیں اس کا موقع عطا فرمایا ہے۔ حکمراں طبقہ اس فرض سے بیشک غافل ہو لیکن مسلمان قوم اس سے کبھی غافل نہیں ہو سکتی۔ اُس کی نظر میں دارالخلافہ، مختلف ہوٹلوں اور نمائشی منصوبوں کی تعمیر ایک مسجد کی تعمیر کے مقابلے میں پرِکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ وزیر صاحب کا یہ جواب پوری مسلم قوم کے دینی احساس کو چیلنج ہے۔ ہم بجا طور پر اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ پاکستانی عوام اس کارِ خیر میں جماعت اسلامی کے ساتھ پوری گرم جوشی اور جذبہ اخلاص کے ساتھ تعاون کریں گے۔

مسجد ایک عمارت نہیں بلکہ اللہ کا گھر، ایک مسلمان کے مذہبی احساس کا مظہر اور اُس کی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اُس کی تعمیر درحقیقت اُس کے دینی احساسات کی تعمیر ہے اور اس معاملے میں غفلت درحقیقت دین سے غفلت کی کھلی شہادت ہے۔

اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ ۔ (التوبہ - ۱۸)

اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کے آباد کار تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت کو مانیں اور نماز قائم کریں۔ زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ پس یہ توقع ہے کہ وہی سیدھی راہ چلیں گے۔

ترجمان القرآن کے گزشتہ شمارے میں ہم نے مقبوضہ کشمیر کے مہاجرین کی بحالی کے سلسلے میں جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کا ذکر کیا تھا۔ اس شعبے کے ناظم جناب صدیق الحسن گیلانی صاحب نے ہمیں صحیح اعداد و شمار فراہم کیے ہیں جنہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

مختلف مدات سے کل آمدنی =

۲۹۵۱۶۹٫۶۸

خرچ:

آزاد کشمیر کے صدر کی خدمت میں جو رقم پیش کی گئی	۱،۲۵،۰۰۰٫۰۰
نشر و اشاعت، ڈاک اور سٹیشنری	۱،۲۵۰٫۹۵
لحاف اور برتنوں کی خرید =	۲۸،۵۵۱٫۲۳
پیکنگ، باربرداری کے اخراجات =	۸،۷۳۴٫۲۶
کارکنوں کی تنخواہ اور دوسرے الاؤنس۔	۵،۹۸۵٫۰۰
رضاکاروں کو الاؤنس	۱،۸۱۱٫۴۸

(باقی صـ ۴۲ پر)

تفہیم القرآن

الحجرات

(۳)

لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے[۲۸]۔ یقیناً اللہ سب کچھ

۲۸۔ پچھلی آیات میں اہلِ ایمان کو خطاب کر کے وہ ہدایات دی گئی تھیں جو مسلم معاشرے کو خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ اب اِس آیت میں پوری نوعِ انسانی کو خطاب کر کے اُس عظیم گمراہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دنیا میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے، یعنی نسل، رنگ، وطن اور قومیت کا تعصب۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدائش کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں اِن کی بنا ایک خاندان، قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے، اور کہیں ایک جغرافی خطے میں یا ایک خاص رنگ رکھنے والی یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہو جانا۔ پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے وہ صرف اِس حد تک محدود نہیں رہی ہے کہ جنہیں اِس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو ان کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اِس تمیز نے نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اِس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں۔ مذہب ایجاد کیے گئے ہیں۔ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اخلاقی

اصول وضع کیے گئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں نے اس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھیرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا جس کی رُو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اُونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھیرائے گئے، اور شودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، آج اس بیسویں صدی ہی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کر کے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا اس کی تہ میں بھی یہی تصوّر کارفرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حدُود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو اُن پر مباح ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان کو لُوٹیں، غلام بنائیں، اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے اس کی بدترین مثالیں زمانۂ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور آج دیکھی جا رہی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصوّر پچھلی جنگِ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے تین نہایت اہم اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ تم سب کی اصل ایک ہے، ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے، اور آج تمہاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک

ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔ اِس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اُس تفرقے اور اُونچ نیچ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے جس کے زعمِ باطل میں تم مبتلا ہو۔ ایک ہی خدا تمہارا خالق ہے، ایسا نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف خداؤں نے پیدا کیا ہو۔ ایک ہی مادۂ تخلیق سے تم بنے ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ انسان کسی پاک یا بڑھیا مادّے سے بنے ہوں اور کچھ دوسرے انسان کسی ناپاک یا گھٹیا مادّے سے بن گئے ہوں۔ ایک ہی طریقے سے تم پیدا ہوئے ہو، یہ بھی نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کے طریقِ پیدائش الگ الگ ہوں۔ اور ایک ہی ماں باپ کی تم اولاد ہو، یہ بھی نہیں ہُوا ہے کہ ابتدائی انسانی جوڑے بہت سے رہے ہوں جن سے دنیا کے مختلف خِطّوں کی آبادیاں الگ الگ پیدا ہوئی ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ پُوری روئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان تو نہیں ہو سکتا تھا۔ نسل بڑھنے کے ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں اور پھر خاندانوں سے قبائل اور اقوام وجود میں آجائیں۔ اسی طرح زمین کے مختلف خِطّوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ، خدوخال، زبانیں اور طرزِ بود و ماند بھی لامحالہ مختلف ہی ہو جانے تھے، اور ایک خطّے کے رہنے والوں کو باہم قریب تر اور دُور دراز خِطّوں کے رہنے والوں کو بعید تر ہی ہونا تھا۔ مگر اس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اُونچ اور نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کیے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل و حقیر جانیں، ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوق جمائے اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح حاصل ہو۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتّب کیا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اُن کے درمیان باہمی تعارف اور تعاون کی فطری صورت یہی تھی۔ اِسی طریقے سے ایک خاندان، ایک برادری، ایک قبیلے اور ایک قوم کے لوگ مل کر مشترک معاشرت بنا سکتے تھے اور زندگی کے معاملات میں ایک

دوسرے کے مددگار بن سکتے تھے۔ مگر یہ محض شیطانی جہالت تھی کہ جس چیز کو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے تعارف کا ذریعہ بنایا تھا اُسے تفاخر اور تنافر کا ذریعہ بنا لیا گیا اور پھر نوبت ظلم و عُدوان تک پہنچا دی گئی۔

تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں، کیونکہ ان کا پیدا کرنے والا ایک ہے، ان کا مادّۂ پیدائش اور طریقِ پیدائش ایک ہی ہے، اور ان سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے۔ علاوہ بریں کسی شخص کا کسی خاص ملک، قوم یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے جس میں اُس کے اپنے ارادہ و انتخاب اور اس کی اپنی سعی و کوشش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اِس لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا، بُرائیوں سے بچنے والا، اور نیکی و پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنی ذاتی خوبی کی بنا پر قابلِ قدر ہے۔ اور جس کا حال اِس کے برعکس ہو وہ بہر حال ایک کمتر درجے کا انسان ہے چاہے وہ کالا ہو یا گورا، مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔

یہی حقائق جو قرآن کی ایک مختصر سی آیت میں بیان کیے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے مختلف خطبات اور ارشادات میں زیادہ کھول کر بیان فرمایا ہے۔ فتحِ مکہ کے موقع پر طوافِ کعبہ کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں فرمایا:

الحمد للہ الذی اذھب عنکم عَیبۃَ الجٰھلیۃ و تکبّرھا۔ یا ایھا النّاس النّاس رجلان، بَرٌّ تقی کریمٌ علی اللہ، و فاجرٌ شقی ھَیّنٌ علی اللہ۔ النّاس	شکر ہے اُس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبّر دور کر دیا۔ لوگو، تمام انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار، جو اللہ کی نگاہ میں عزّت

کلکم بنوا آدم، وخلق اللہ آدم من تراب۔ (بیہقی فی شعب الایمان، ترمذی).

والا ہے۔ دوسرا فاجر اور شقی جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس میں فرمایا:

یا ایہا الناس، الا ان ربکم واحدٌ لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا لاسود على احمر ولا لاحمر على اسود الا بالتقوى۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ الا ھل بلغتُ؟ قالوا بلیٰ یا رسول اللہ، قال فلیبلغ الشاھد الغائب۔ (بیہقی)

لوگو، خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ، میں نے تمہیں بات پہنچا دی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ۔ فرمایا، اچھا تو جو موجود ہے وہ ان لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے

کلکم بنوا آدم وآدم خلق من تراب، ولینتہینّ قوم یفخرون بآبائھم او لیکونن اھون علی اللہ من الجعلان (بزار)

تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ ذلیل ہونگے۔

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

ان اللہ لا یسئلکم عن احسابکم

اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھیگا۔

ولا عن انسابکم یوم القیمۃ، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (ابن جریر)	اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ لا ینظر الی صُوَرکم و اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم (مسلم۔ ابن ماجہ)	اللہ تمہاری صورتیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔

یہ تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک ہی محدود نہیں رہی ہیں بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہلِ ایمان کی ایک عالمگیر برادری عملاً قائم کر کے دکھا دی ہے جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں، جس میں اونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق و تعصب کا کوئی تصور نہیں، جس میں شریک ہونے والے تمام انسان خواہ وہ کسی نسل و قوم اور ملک و وطن سے تعلق رکھتے ہوں بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مساوات اور وحدت کے اصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے اس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی دین اور کسی نظام میں نہیں پائی جاتی نہ کبھی پائی گئی ہے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے روئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک امت بنا دیا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی کو رفع کر دینا بھی ضروری ہے۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں اسلامی قانون کفو کو جو اہمیت دیتا ہے اس کو بعض لوگ اس معنی میں لیتے ہیں کہ کچھ برادریاں شریف اور کچھ کمین ہیں اور ان کے درمیان مناکحت قابلِ اعتراض ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک غلط خیال ہے۔ اسلامی قانون کی رُو سے ہر مسلمان مرد کا ہر مسلمان عورت سے نکاح ہو سکتا ہے، مگر ازدواجی زندگی کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ زوجین کے درمیان عادات، خصائل، طرزِ زندگی، خاندانی روایات اور معاشی و معاشرتی حالات میں زیادہ سے زیادہ مطابقت ہو تاکہ وہ ایک دوسرے

جاننے والا اور باخبر ہے۔[۲۹]

یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔[۳۰] اِن سے کہو، تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ

کے ساتھ اچھی طرح نباہ کر سکیں۔ یہی کفاءت کا اصل مقصد ہے۔ جہاں مرد اور عورت کے درمیان اس لحاظ سے بہت زیادہ بُعد ہو وہاں عمر بھر کی رفاقت نبھ جانے کی کم ہی توقع ہو سکتی ہے، اس لیے اسلامی قانون ایسے جوڑ لگانے کو ناپسند کرتا ہے، نہ اِس بنا پر کہ فریقین میں سے ایک شریف اور دوسرا کمین ہے، بلکہ اس بنا پر کہ حالات میں زیادہ بیّن فرق و اختلاف ہو تو شادی بیاہ کا تعلق قائم کرنے میں ازدواجی زندگیوں کے ناکام ہو جانے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔

۲۹؎ یعنی یہ بات اللہ ہی جانتا ہے کہ کون فی الواقع ایک اعلیٰ درجہ کا انسان ہے اور کون اوصاف کے لحاظ سے ادنیٰ درجے کا ہے۔ لوگوں نے بطورِ خود اعلیٰ اور ادنیٰ کے جو معیار بنا رکھے ہیں یہ اللہ کے ہاں چلنے والے نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جس کو دنیا میں بہت بلند مرتبے کا آدمی سمجھا گیا ہو وہ اللہ کے آخری فیصلے میں کم ترین خلائق قرار پائے، اور ہو سکتا ہے کہ جو یہاں بہت حقیر سمجھا گیا ہو وہ وہاں بڑا اونچا مرتبہ پائے۔ اصل اہمیت دنیا کی عزت و ذلت کی نہیں بلکہ اُس ذلت و عزت کی ہے جو خدا کے ہاں کسی کو نصیب ہو۔ اس لیے انسان کو ساری فکر اس امر کی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے اندر وہ حقیقی اوصاف پیدا کرے جو اسے اللہ کی نگاہ میں عزت کے لائق بنا سکتے ہوں۔

۳۰؎ اِس سے مراد تمام بدوی نہیں ہیں بلکہ یہاں ذکر چند خاص بدوی گروہوں کا ہو رہا ہے جو اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر محض اِس خیال سے مسلمان ہو گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کی ضرب سے محفوظ بھی رہیں گے اور اسلامی فتوحات کے فوائد سے متمتع بھی ہوں گے۔ یہ لوگ حقیقت میں سچے دل سے ایمان نہیں لائے تھے، محض زبانی اقرارِ ایمان کر کے انہوں نے مصلحتہً اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرا لیا تھا۔ اور اُن کی اِس باطنی حالت کا راز اُس وقت فاش ہو جاتا تھا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر طرح طرح کے مطالبے کرتے تھے اور اپنا حق اس طرح جتاتے تھے کہ گویا انہوں نے اسلام قبول کر کے آپ پر بڑا احسان کیا ہے۔ روایات میں متعدد قبائلی گروہوں کے کس

ہم مطیع ہو گئے[۳۱] ۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے ۔ اگر تم اللہ اور اس کے

ردیے کا ذکر آیا ہے ۔ مثلاً مزینہ، جہینہ، اسلم، اشجع، غفار وغیرہ ۔ خاص طور پر بنی اسد بن خزیمہ کے متعلق ابن عباس اور سعید بن جُبَیر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ خشک سالی کے زمانہ میں وہ مدینہ آئے اور مالی مدد کا مطالبہ کرتے ہوئے بار بار انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "ہم بغیر لڑے بھڑے مسلمان ہوتے ہیں، ہم نے آپ سے اُس طرح جنگ نہیں کی جس طرح فلاں اور فلاں قبیلوں نے جنگ کی ہے"۔ اِس سے اُن کا صاف مطلب یہ تھا کہ اللہ کے رسول سے جنگ نہ کرنا اور اسلام قبول کر لینا ان کا ایک احسان ہے جس کا معاوضہ اُنہیں رسول اور اہلِ ایمان سے ملنا چاہیے ۔ اطرافِ مدینہ کے بدوی گروہوں کا یہی وہ طرزِ عمل ہے جس پر اِن آیات میں تبصرہ کیا گیا ہے ۔ اِس تبصرے کے ساتھ سورۂ توبہ آیات ۹۰ تا ۱۱۰، اور سورۂ فتح آیات ۱۱ تا ۱۷ کو ملا کر پڑھا جائے تو بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے ۔

[۳۱] اصل میں قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "کہو ہم مسلمان ہو گئے ہیں"۔ ان الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ قرآن مجید کی زبان میں "مومن" اور "مسلم" دو متقابل اصطلاحیں ہیں، مومن وہ ہے جو سچے دل سے ایمان لایا ہو اور مسلم وہ ہے جس نے ایمان کے بغیر محض ظاہر میں اسلام قبول کر لیا ہو۔ لیکن درحقیقت یہ خیال بالکل غلط ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اِس جگہ ایمان کا لفظ قلبی تصدیق کے لیے اور اسلام کا لفظ محض ظاہری اطاعت کے لیے استعمال ہوا ہے ۔ مگر یہ سمجھ لینا صحیح نہیں ہے کہ یہ قرآن مجید کی دو مستقل اور باہم متقابل اصطلاحیں ہیں ۔ قرآن کی جن آیات میں اسلام اور مسلم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا تتبع کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں "اسلام" اُس دینِ حق کا نام ہے جو اللہ نے نوعِ انسانی کے لیے نازل کیا ہے ، اُس کے مفہوم میں ایمان اور اطاعتِ امر دونوں شامل ہیں ، اور "مسلم" وہ ہے جو سچے دل سے مانے اور عملاً اطاعت کرے ۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل آیات ملاحظہ ہوں :

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آل عمران ۱۹)	یقیناً اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ (آل عمران ۸۵)	اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے اس کا وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔
وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ ۳)	اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کیا ہے۔
فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ۔ (الانعام ۱۲۵)	اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان آیات میں "اسلام" سے مراد اطاعت بلا ایمان نہیں ہے۔ پھر دیکھیے جگہ جگہ اس مضمون کی آیات آتی ہیں:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ (الانعام ۱۴)	اے نبی کہو مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اسلام لانے والا میں ہوں۔
فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا (آل عمران ۲۰)	پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو انہوں نے ہدایت پائی۔
یَحْکُمُ بِھَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا (المائدہ ۴۴)	تمام انبیاء جو اسلام لائے تھے تورات کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔

کیا یہاں اور اس طرح کے بیسیوں دوسرے مقامات پر اسلام قبول کرنے یا اسلام لانے کا مطلب ایمان کے بغیر اطاعت اختیار کر لینا ہے؟ اسی طرح "مسلم" کا لفظ بار بار جس معنی میں استعمال ہوا ہے اس کے لیے نمونے کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران ۱۰۲)	اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔
ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَ	اس نے تمہارا نام پہلے بھی مسلم رکھا تھا اور اس کتاب

رسول کی فرمانبرداری اختیار کر لو تو وہ تمہارے اعمال کے اجر میں کوئی کمی نہ کرے گا، یقیناً اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔

اے نبی، اِن مدعیانِ ایمان سے کہو، کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم واقعی اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو۔ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر پوشیدہ چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اس کی نگاہ میں ہے ؏ ع۲

فِیْ ھٰذَا (الحج - ۷۸)

میں بھی۔

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا (آل عمران - ۶۷)

ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ وہ یک سُو مُسلم تھا۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (البقرہ - ۱۲۸)

(تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی دُعا)، اَے ہمارے رب، اور ہم دونوں کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی اُمّت پیدا کر جو تیری مُسلم ہو۔

يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (البقرہ - ۱۳۲)

(حضرت یعقوبؑ کی وصیت اپنی اولاد کو)، اے میرے بچو، اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے پس تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مُسلم ہو۔

اِن آیات کو پڑھ کر آخر کون یہ خیال کر سکتا ہے کہ ان میں مُسلم سے مراد وہ شخص ہے جو دل سے نہ

مانے، بس ظاہری طور پر اسلام قبول کرے؟ اس لیے یہ دعویٰ کرنا قطعی غلط ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں اسلام سے مراد اطاعت بلا ایمان ہے اور مُسلم قرآن کی زبان میں محض بظاہر اسلام قبول کر لینے والے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح یہ دعویٰ کرنا بھی غلط ہے کہ ایمان اور مومن کے الفاظ قرآن مجید میں لازماً سچے دل سے ماننے ہی کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ بلاشبہ اکثر مقامات پر یہ الفاظ اسی مفہوم کے لیے آئے ہیں، لیکن بکثرت مقامات ایسے بھی ہیں جہاں یہ الفاظ ظاہری اقرار ایمان کے لیے بھی استعمال کیے گئے ہیں اور ان سب لوگوں کو یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر خطاب کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے گروہ میں زبانی اقرار کر کے شامل ہوئے ہوں قطع نظر اس سے کہ وہ سچے مومن ہوں یا ضعیف الایمان، یا محض منافق۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے صرف چند کے لیے ملاحظہ ہو آل عمران، آیت ۱۵۶، النساء، ۱۳۶۔ المائدہ، ۵۴۔ الانفال، ۲۰۔ الانفال، ۲۷۔ التوبہ، ۳۸۔ الحدید، ۲۸۔ الصف، ۲۔

تفہیم القرآن

ق

نام | آغاز ہی کے حرف ق سے ماخوذ ہے مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس کا افتتاح حرف ق سے ہوتا ہے۔

زمانۂ نزول | کسی معتبر روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ ٹھیک کس زمانہ میں نازل ہوئی ہے مگر مضامین پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکۂ معظمہ کا دوسرا دور ہے جو نبوت کے تیسرے سال سے شروع ہو کر پانچویں سال تک رہا۔ اس دور کی خصوصیات ہم سورۂ انعام کے دیباچہ میں بیان کر چکے ہیں۔ ان خصوصیات کے لحاظ سے اندازاً یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ سورۃ پانچویں سال میں نازل ہوئی ہو گی جبکہ کفار کی مخالفت اچھی خاصی شدت اختیار کر چکی تھی، مگر ابھی ظلم و ستم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

موضوع اور مباحث | معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر عیدین کی نمازوں میں اس سورہ کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ایک خاتون اُمّ ہشام بنتِ حارثہ، جو حضورؐ کی پڑوسن تھیں، بیان کرتی ہیں کہ مجھے سورۂ ق یاد ہی اس طرح ہوئی کہ میں جمعہ کے خطبوں میں اکثر آپ کی زبانِ مبارک سے اس کو سنتی تھی۔ بعض اور روایات میں آیا ہے کہ فجر کی نماز میں بھی آپ بکثرت اس کو پڑھا کرتے تھے۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ حضورؐ کی نگاہ میں یہ ایک بڑی اہم سورۃ تھی۔ اسی لیے آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک بار بار اس کے مضامین پہنچانے کا اہتمام فرماتے تھے۔

اس اہمیت کی وجہ سورۃ کو بغور پڑھنے سے بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ پوری سورۃ کا موضوع آخرت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ معظمہ میں اپنی دعوت کا آغاز کیا تو لوگوں کو سب سے زیادہ اچنبھا آپ کی جس بات پر ہوا وہ یہ تھی کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ تو بالکل انہونی بات ہے، عقل باور نہیں کرتی کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہمارا ذرہ ذرہ زمین میں منتشر ہو چکا ہو تو ان پراگندہ اجزاء کو ہزارہا برس گزرنے کے بعد پھر سے اکٹھا کر کے ہمارا یہی جسم از سرِ نو بنا دیا جائے اور ہم زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تقریر نازل ہوئی۔ اس میں بڑے مختصر طریقے سے چھوٹے چھوٹے فقروں میں ایک طرف آخرت کے امکان اور اس کے وقوع پر دلائل دیئے گئے ہیں، اور دوسری طرف لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم خواہ تعجب کرو، یا بعید از عقل سمجھو، یا جھٹلاؤ، بہر حال اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ حقیقت، اور قطعی اٹل حقیقت یہ ہے کہ تمہارے جسم کا ایک ایک ذرہ جو زمین میں منتشر ہوتا ہے، اس کے متعلق اللہ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس حال میں کس جگہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ اس کے لیے کافی ہے کہ یہ تمام منتشر ذرات پھر جمع ہو جائیں اور تم کو اُسی طرح دوبارہ بنا کھڑا کیا جائے جیسے پہلے بنایا گیا تھا۔ اِسی طرح تمہارا یہ خیال کہ تم یہاں شترِ بے مہار بنا کر چھوڑ دیئے گئے ہو اور کسی کے سامنے تمہیں جواب دہی نہیں کرنی ہے، ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ براہِ راست خود بھی تمہارے ہر قول و فعل سے، بلکہ تمہارے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے، اور اس کے فرشتے بھی تم میں سے ہر شخص کے ساتھ لگے ہوئے تمام حرکات و سکنات کا ریکارڈ محفوظ کر رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو ایک پکار پر تم بالکل

اُسی طرح نکل کھڑے ہو گے جس طرح بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی زمین سے نباتات کی کونپلیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اُس وقت یہ غفلت کا پردہ جو آج تمہاری عقل پر پڑا ہُوا ہے، تمہارے سامنے سے ہٹ جائے گا اور تم اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ لو گے جس کا آج انکار کر رہے ہو۔ اُس وقت تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم دنیا میں غیر ذمّہ دار نہیں تھے بلکہ ذمّہ دار اور جواب دہ تھے۔ جزا و سزا، عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ، جنہیں آج فسانۂ عجائب سمجھ رہے ہو، اُس وقت یہ ساری چیزیں تمہاری مشہود حقیقتیں ہونگی۔ حق سے عناد کی پاداش میں اُسی جہنم کے اندر پھینکے جاؤ گے جسے آج عقل سے بعید سمجھتے ہو، اور خدائے رحمان سے ڈر کر راہِ راست کی طرف پلٹ آنے والے تمہاری آنکھوں کے سامنے اسی جنت میں جائیں گے جس کا ذکر سُن کر آج تمہیں تعجب ہو رہا ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

قٓ، قسم ہے قرآن مجید[1] کی ——— بلکہ اِن لوگوں کو اِس بات پر تعجب ہُوا کہ ایک

---

[1] "مجید" کا لفظ عربی زبان میں دو معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ایک، بلند مرتبہ، باعظمت بزرگ اور صاحبِ عزت و شرف۔ دوسرے، کریم، کثیر العطاء، بہت نفع پہنچانے والا۔ قرآن کے لیے یہ لفظ ان دونوں معنوں میں استعمال فرمایا گیا ہے۔ قرآن اِس لحاظ سے عظیم ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس کے مقابلے میں نہیں لائی جا سکتی۔ اپنی زبان اور ادب کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ ہے اور اپنی تعلیم اور حکمت کے لحاظ سے بھی معجزہ۔ جس وقت وہ نازل ہُوا تھا اُس وقت بھی انسان اس کے مانند کلام بنا کر لانے سے عاجز تھے اور آج بھی عاجز ہیں۔ اس کی کوئی بات کبھی کسی زمانے میں غلط ثابت نہیں کی جا سکی ہے نہ کی جا سکتی ہے۔ باطل نہ سامنے سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہے نہ پیچھے سے حملہ آور ہو کر اسے شکست دے سکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ کریم ہے کہ انسان جس قدر زیادہ

خبردار کرنے والا خود اِنہی میں سے اِن کے پاس آگیا۔[۲] پھر منکرین کہنے لگے "یہ تو عجیب بات ہے،

اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے اسی قدر زیادہ وہ اس کو رہنمائی دیتا ہے اور جتنی زیادہ اُس کی پیروی کرے اتنی ہی زیادہ اسے دنیا اور آخرت کی بھلائیاں حاصل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اُس کے فوائد ومنافع کی کوئی حد نہیں ہے جہاں جاکر انسان اس سے بے نیاز ہو سکتا ہو، یا جہاں پہنچ کر اس کی نفع بخشی ختم ہو جاتی ہو۔

[۲] یہ فقرہ بلاغت کا بہترین نمونہ ہے جس میں ایک بہت بڑے مضمون کو چند مختصر الفاظ میں سمو دیا گیا ہے۔ قرآن کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اُسے بیان نہیں کیا گیا۔ اس کا ذکر کرنے کے بجائے بیچ میں ایک لطیف خلا چھوڑ کر آگے کی بات "بلکہ" سے شروع کر دی گئی ہے۔ آدمی ذرا غور کرے اور اُس پس منظر کو بھی نگاہ میں رکھے جس میں یہ بات فرمائی گئی ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ قسم اور بلکہ کے درمیان جو خلا چھوڑ دیا گیا ہے اس کا مضمون کیا ہے۔ اس میں دراصل قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ مکہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے سے کسی معقول بنیاد پر انکار نہیں کیا ہے" بلکہ اس سراسر غیر معقول بنیاد پر کیا ہے کہ ان کی اپنی ہی جنس کے ایک بشر، اور ان کی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کا خدا کی طرف سے خبردار بن کر آجانا اُن کے نزدیک سخت قابلِ تعجب بات ہے۔ حالانکہ تعجب کے قابل بات اگر ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ خدا اپنے بندوں کی بھلائی اور بُرائی سے بے پروا ہو کر انہیں خبردار کرنے کا کوئی انتظام نہ کرتا، یا انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے کسی غیر انسان کو بھیجتا، یا عربوں کو خبردار کرنے کے لیے کسی چینی کو بھیج دیتا۔ اس لیے انکار کی یہ بنیاد تو قطعی نامعقول ہے اور ایک صاحبِ عقلِ سلیم یقیناً یہ ماننے پر مجبور ہے کہ خدا کی طرف سے بندوں کو خبردار کرنے کا انتظام ضرور ہونا چاہیے اور اسی شکل میں ہونا چاہیے کہ خبردار کرنے والا خود اِنہی لوگوں میں سے کوئی شخص ہو جن کے درمیان وہ بھیجا گیا ہو۔ اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ شخص ہیں جنہیں خدا نے اِس کام کے لیے بھیجا ہے، تو اس کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی اور شہادت کی حاجت نہیں، یہ عظیم وکریم قرآن، جسے وہ پیش کر رہے ہیں، اس بات کا ثبوت دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے)؟ یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے۔[۳] (حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔[۴]

بلکہ اِن لوگوں نے تو جس وقت حق اِن کے پاس آیا اُسی وقت اُسے صاف جھٹلا دیا۔

اِس تشریح سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں قرآن کی قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں اور ان کی رسالت پر کفار کا تعجب بے جا ہے، اور قرآن کے "مجید" ہونے کو اِس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔

۳؎ یہ ان لوگوں کا دوسرا تعجب تھا۔ پہلا تعجب اس بات پر تھا کہ انہی کی جنس اور قوم کے ایک فرد نے اٹھ کر دعویٰ کیا کہ مَیں خدا کی طرف سے تمہیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اور پھر مزید تعجب انہیں اس بات پر ہُوا کہ وہ شخص انہیں جس چیز سے خبردار کر رہا تھا وہ یہ تھی کہ تمام انسان مرنے کے بعد ازسرِ نَو زندہ کیے جائیں گے، اور ان سب کو اکٹھا کر کے اللہ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ان کے اعمال کا محاسبہ کرنے کے بعد جزا اور سزا دی جائے گی۔

۴؎ یعنی یہ بات اگر اِن لوگوں کی عقل میں نہیں سماتی تو یہ اِن کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ اِس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اللہ کا علم اور اس کی قدرت بھی تنگ ہو جائے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک مرنے والے بے شمار انسانوں کے جسم کے اجزاء جو زمین میں بکھر چکے ہیں اور آئندہ بکھرتے چلے جائیں گے، ان کو جمع کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ہر جز جس شکل میں جہاں بھی ہے، اللہ تعالیٰ براہِ راست اس کو جانتا ہے، اور مزید براں اس کا پورا ریکارڈ اللہ کے دفتر میں محفوظ کیا جا رہا ہے جس سے کوئی ایک ذرہ بھی چھوٹا ہُوا نہیں ہے۔ جس وقت اللہ کا حکم ہوگا اسی وقت آناً فاناً اُس کے فرشتے اِس ریکارڈ سے رجوع کر کے ایک ایک ذرے کو نکال لائیں گے اور تمام انسانوں کے وہی جسم پھر بنا دیں گے جن میں رہ کر انہوں نے دنیا کی زندگی میں کام کیا تھا۔

اسی وجہ سے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔ ۵

یہ آیت بھی من جملہ اُن آیات کے ہے جن میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ آخرت کی زندگی نہ صرف یہ کہ ویسی ہی جسمانی زندگی ہوگی جیسی اِس دنیا میں ہے، بلکہ جسم بھی ہر شخص کا وہی ہوگا جو اس دنیا میں تھا۔ اگر حقیقت یہ نہ ہوتی تو کفار کی بات کے جواب میں یہ کہنا بالکل بے معنی تھا کہ زمین تمہارے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ذرہ ذرہ کا ریکارڈ موجود ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ حٰم السجدہ، حاشیہ ۲۵)

۵ اس مختصر سے فقرے میں بھی ایک بہت بڑا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اِن لوگوں نے صرف تعجب کرنے اور بعید از عقل ٹھیرانے پر ہی اکتفا نہ کیا، بلکہ جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتِ حق پیش کی اُسی وقت بلا تامل اُسے قطعی جھوٹ قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ ہونا تھا اور یہی ہُوا کہ انہیں اِس دعوت اور اس کے پیش کرنے والے رسول کے معاملہ میں کسی ایک موقف پر قرار نہیں ہے۔ کبھی اس کو شاعر کہتے ہیں تو کبھی کاہن اور کبھی مجنون۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ جادُوگر ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ کسی نے اس پر جادُو کر دیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے خود یہ چیز بنا لایا ہے اور کبھی یہ الزام تراشتے ہیں کہ اس کے پسِ پشت کچھ دوسرے لوگ ہیں جو یہ کلام گھڑ گھڑ کر اسے دیتے ہیں۔ یہ متضاد باتیں خود ظاہر کرتی ہیں کہ یہ لوگ اپنے موقف میں بالکل اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ اِس الجھن میں یہ ہرگز نہ پڑتے اگر جلد بازی کر کے نبی کو پہلے ہی قدم پر جھٹلا نہ دیتے اور بلا فکر و تامل ایک پیشگی فیصلہ صادر کر دینے سے پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے کہ یہ دعوت کون پیش کر رہا ہے، کیا بات کہہ رہا ہے اور اس کے لیے دلیل کیا دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اِن کے لیے اجنبی نہ تھا کہیں سے اچانک ان کے درمیان نہ آکھڑا ہُوا تھا۔ اِن کی اپنی ہی قوم کا فرد تھا۔ اِن کا اپنا دیکھا بھالا آدمی تھا۔ یہ اس کی سیرت و کردار اور اس کی قابلیت سے ناواقف نہ تھے۔ ایسے آدمی کی طرف سے جب ایک بات پیش کی گئی تھی تو چاہے اسے فوراً قبول نہ کر لیا جاتا، مگر وہ اِس کی مستحق بھی تو نہ تھی کہ سنتے ہی اسے رد کر دیا جاتا۔ پھر وہ بات بے دلیل بھی نہ تھی۔ وہ اس کے لیے دلائل پیش کر رہا تھا۔ چاہیے تھا کہ اس کے دلائل کھلے کانوں سے سُنے

اچھا،[۱] تو کیا اِنہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا،[۲] اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے[۳]۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ جمائے

جاتے اور تعصب کے بغیر اِن کو جانچ کر دیکھا جاتا کہ وہ کہاں تک معقول ہیں لیکن یہ روش اختیار کرنے کے بجائے جب اِن لوگوں نے ضد میں آکر ابتداہی میں اُسے جھٹلا دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حقیقت تک پہنچنے کا دروازہ تو انہوں نے اپنے لیے خود بند کر لیا اور ہر طرف بھٹکتے پھرنے کے بہت سے راستے کھول لیے۔ اب یہ اپنی ابتدائی غلطی کو نباہنے کے لیے دس متضاد باتیں تو بنا سکتے ہیں مگر اس ایک بات کو سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ نبی سچا بھی ہو سکتا ہے اور اس کی پیش کردہ بات حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔

[۱] اوپر کی پانچ آیتوں میں کفارِ مکہ کے موقف کی نامعقولیت واضح کرنے کے بعد اب بتایا جا رہا ہے کہ آخرت کی جو خبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اس کی صحت کے دلائل کیا ہیں۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کفار جن دو باتوں پر تعجب کا اظہار کر رہے تھے ان میں سے ایک، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے برحق ہونے کی دو دلیلیں ابتداہی میں دی جاچکی ہیں۔ اول یہ کہ وہ تمہارے سامنے قرآن مجید پیش کر رہے ہیں جو اُن کے نبی ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ دوم یہ کہ وہ تمہاری اپنی جنس اور قوم اور برادری کے آدمی ہیں۔ اچانک آسمان سے یا کسی دوسری سرزمین سے نہیں آگئے ہیں کہ تمہارے لیے ان کی زندگی اور سیرت و کردار کو جانچ کر یہ تحقیق کرنا مشکل ہو کہ وہ قابلِ اعتماد آدمی ہیں یا نہیں اور یہ قرآن اُن کا اپنا گھڑا ہوا کلام ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ اس لیے ان کے دعوائے نبوت پر تمہارا تعجب بے جا ہے۔ یہ استدلال تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کے بجائے دو مختصر اشاروں کی شکل میں بیان کیا گیا ہے، کیونکہ جس زمانے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود مکہ میں کھڑے ہو کر اُن لوگوں کو قرآن سُنا رہے تھے جو بچپن سے جوانی اور ادھیڑ عمر تک آپ کی ساری زندگی دیکھے ہوئے تھے، اُس وقت اِن اشاروں کی پوری تفصیل ماحول کے ہر شخص پر آپ ہی واضح تھی۔ اس لیے اُس کو چھوڑ کر اب تفصیلی استدلال اُس دوسری بات کی صداقت پر کیا جا رہا ہے جس کو وہ لوگ عجیب اور عقل سے بعید کہہ رہے تھے۔

[۲] یہاں آسمان سے مراد وہ پورا عالمِ بالا ہے جسے انسان شب و روز اپنے اوپر چھایا ہوا

دیکھتا ہے۔ جس میں دن کو سورج چمکتا ہے اور رات کو چاند اور بے حد و حساب تارے روشن نظر آتے ہیں۔ جسے آدمی برہنہ آنکھ ہی سے دیکھے تو حیرت طاری ہو جاتی ہے، لیکن اگر دُور بین لگالے تو ایک ایسی وسیع و عریض کائنات اُس کے سامنے آتی ہے جو ناپیدا کنار ہے، کہیں سے شروع ہو کر کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہماری زمین سے لاکھوں گُنے بڑے عظیم الشان سیارے اس کے اندر گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سورج سے ہزاروں درجہ زیادہ روشن تارے اس میں چمک رہے ہیں۔ ہمارا یہ پُورا نظامِ شمسی اس کی صرف ایک کہکشاں (GALAXY) کے ایک کونے میں پڑا ہُوا ہے۔ تنہا اِسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم ۳ ارب دوسرے تارے (ثوابت) موجود ہیں، اور اب تک کا انسانی مشاہدہ ایسی ایسی دس لاکھ کہکشانوں کا پتہ دے رہا ہے۔ اِن لاکھوں کہکشانوں میں سے ہماری قریب ترین ہمسایہ کہکشاں اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ اس کی روشنی ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چل کر دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ یہ تو کائنات کے صرف اُس حصے کی وسعت کا حال ہے جو اب تک انسان کے علم اور اس کے مشاہدہ میں آئی ہے۔ خدا کی خدائی کس قدر وسیع ہے، اِس کا کوئی اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کی معلوم کائنات اُس پوری کائنات کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہ رکھتی ہو جو قطرے کو سمندر سے ہے۔ اِس عظیم کارگاہِ ہست و بُود کو جو خدا وجود میں لایا ہے اس کے بارے میں زمین پر رینگنے والا یہ چھوٹا سا حیوانِ ناطق، جس کا نام انسان ہے، اگر یہ حکم لگائے کہ وہ اِسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا، تو یہ اس کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ کائنات کے خالق کی قدرت اس سے کیسے تنگ ہو جائے گی!

ؔ۵ یعنی اپنی اس حیرت انگیز وسعت کے باوجود یہ عظیم الشان نظامِ کائنات ایسا مستحکم ہے اور اس کی بندش اتنی چست ہے کہ اس میں کسی جگہ کوئی دراڑ یا شگاف نہیں ہے۔ اور اس کا تسلسل کہیں جا کر ٹوٹتا نہیں ہے۔ اس چیز کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی ہیئت دانوں نے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے جسے وہ منبع ۳ ج ۲۹۵ (SOURCE 3C 295) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس کی

اور اُس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اُگا دیں[۹]۔ یہ ساری چیزیں آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر اُس بندے کے لیے جو (حق کی طرف) رجوع کرنے والا ہو۔ اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا، پھر اس سے باغ اور فصل کے غلّے اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بر تہ لگتے ہیں۔ یہ انتظام ہے بندوں کو رزق دینے کا۔ اِس پانی سے ہم ایک مُردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں[۱۰]۔ دمرے

جو شعاعیں اب ہم تک پہنچ رہی ہیں وہ ۴ ارب سال سے بھی زیادہ مدت پہلے اس میں سے روانہ ہوئی ہونگی۔ اس بعید ترین فاصلے سے اِن شعاعوں کا زمین تک پہنچنا آخر کیسے ممکن ہوتا اگر زمین اور اُس کہکشاں کے درمیان کائنات کا تسلسل کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہوتا اور اس کی بندش میں کہیں شگاف پڑا ہوا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرکے دراصل یہ سوال آدمی کے سامنے پیش کرتا ہے کہ میری کائنات کے اس نظام میں جب تم ایک ذرا سے رخنے کی نشان دہی بھی نہیں کر سکتے تو میری قدرت میں اس کمزوری کا تصور کہاں سے تمہارے دماغ میں آگیا کہ تمہاری مہلتِ امتحان ختم ہو جانے کے بعد تم سے حساب لینے کے لیے میں تمہیں پھر زندہ کر کے اپنے سامنے حاضر کرنا چاہوں تو نہ کر سکوں گا۔

یہ صرف امکانِ آخرت ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ توحید کا ثبوت بھی ہے۔ چار ارب سال نوری (4000 LIGHT YEARS) کی مسافت سے اِن شعاعوں کا زمین تک پہنچنا، اور یہاں انسان کے بنائے ہوئے آلات کی گرفت میں آنا صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اُس کہکشاں سے لے کر زمین تک کی پوری دنیا مسلسل ایک ہی مادے سے بنی ہوئی ہے، ایک ہی طرح کی قوتیں اس میں کارفرما ہیں، اور کسی فرق و تفاوت کے بغیر وہ سب ایک ہی طرح کے قوانین پر کام کر رہی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شعاعیں نہ یہاں تک پہنچ سکتی تھیں اور نہ اُن آلات کی گرفت میں آسکتی تھیں جو انسان نے زمین اور اس کے ماحول میں کام کرنے والے قوانین کا فہم حاصل کر کے بنائے ہیں۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا خالق و مالک اور حاکم و مدبّر ہے۔

۹ے تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۵۲۰۔ جلد سوم، ص ۵۹۰-۵۹۱۔

ہوتے انسانوں کا زمین سے ، نکلنا بھی اسی طرح ہو گا۔ [۱۱]

جلد چہارم ، الزُخرف ، حاشیہ ۷ ۔

[۱۰] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ، جلد سوم ، ص ۵۸۹ ۔۔ ۵۹۰ - ۵۹۵ - ۷۴۲ - ۷۴۸ - ۷۴۹ ، جلد چہارم ، یٰس ، حاشیہ ۲۹ ۔

[۱۱] استدلال یہ ہے کہ جس خدا نے زمین کے اِس کرّے کو زندہ مخلوقات کی سکونت کے لیے موزوں مقام بنایا ، اور جس نے زمین کی بے جان مٹی کو آسمان کے بے جان پانی کے ساتھ ملا کر اتنی اعلیٰ درجے کی نباتی زندگی پیدا کر دی جسے تم اپنے باغوں اور کھیتوں کی شکل میں لہلہاتے دیکھ رہے ہو ، اور جس نے اِس نباتات کو انسان و حیوان سب کے لیے رزق کا ذریعہ بنا دیا ، اُس کے متعلق تمہارا یہ گمان کہ وہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے ، سراسر بے عقلی کا گمان ہے۔ تم اپنی آنکھوں سے آئے دن دیکھتے ہو کہ ایک علاقہ بالکل خشک اور بے جان پڑا ہوا ہے ۔ بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی اس کے اندر سے یکایک زندگی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں ، مدّتوں کی مری ہوئی جڑیں یک لخت جی اٹھتی ہیں ، اور طرح طرح کے حشرات الارض زمین کی تہوں سے نکل کر اچھل کود شروع کر دیتے ہیں ۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ناممکن نہیں ہے ۔ اپنے اس صریح مشاہدے کو جب تم نہیں جھٹلا سکتے تو اس بات کو کیسے جھٹلاتے ہو کہ جب خدا چاہے گا تم خود بھی اُسی طرح زمین سے نکل آؤ گے جس طرح نباتات کی کونپلیں نکل آتی ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ عرب کی سرزمین میں بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں بسا اوقات پانچ پانچ برس بارش نہیں ہوتی بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ مدت گزر جاتی ہے اور آسمان سے ایک قطرہ تک نہیں ٹپکتا ۔ اتنے طویل زمانے تک تپتے ہوئے ریگستانوں میں گھاس کی جڑوں اور حشرات الارض کا زندہ رہنا قابلِ تصور نہیں ہے ۔ اس کے باوجود جب وہاں کسی وقت تھوڑی سی بارش بھی ہو جاتی ہے تو گھاس نکل آتی ہے اور حشرات الارض جی اٹھتے ہیں ۔ اس لیے عرب کے لوگ اِس استدلال کو اُن لوگوں کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنہیں اتنی طویل خشک سالی کا تجربہ نہیں ہوتا ۔

عائلی قانون میں جماعت اسلامی کی تجویز کردہ اصلاحات

[جیسا کہ اخبارات کے ذریعہ سے معلوم ہو چکا ہے، اسلامی مشاورتی کونسل کے سامنے اس وقت ۱۹۶۰ء کا فیملی لاز آرڈی ننس زیرِ غور ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان نے اس موقع پر اتمامِ حجت کے لیے ایک ترمیمی مسودۂ قانون مرتب کر کے کونسل کو بھیج دیا ہے تاکہ ہماری طرف سے یہ بتانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے کہ شریعت کے مطابق اس قانون میں کیا اصلاحات ہونی چاہییں۔ افادۂ عام کے لیے ان صفحات میں اصل قانون کی قابلِ اعتراض دفعات کا خلاصہ اور اس کے بالمقابل جماعت اسلامی کے پیش کردہ بل کی دفعات کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ترتیب یہ ہے کہ پہلے آرڈی ننس کی دفعہ کا ملخص پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد جماعت کے ترمیمی بل کی دفعہ درج کر دی گئی ہے۔

اس کے ساتھ جماعت نے وہ کتابچہ بھی مشاورتی کونسل کو ارسال کیا ہے جس میں اس آرڈی ننس پر ملک بھر کے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام کی تنقیدات شامل ہیں۔]

تعریفات

آرڈی ننس کی دفعہ ۲ میں عائلی تنازعات کے تصفیہ کے لیے ایک مصالحتی کونسل تجویز کی گئی ہے، جو ایک چیئرمین اور فریقین کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ہو گی۔ اس کے ساتھ حسبِ ذیل شرائط عائد کی گئی ہیں:

(ا) اگر فریقین ایک متعین مدت کے اندر اپنے نمائندے نامزد نہ کریں تو ان کے بغیر ہی کونسل کی تشکیل ہو جائے گی۔

(ب) چیئرمین سے مراد یونین کونسل کا چیئرمین ہو گا یا کوئی ایسا شخص ہو گا، جسے مرکزی یا صوبائی حکومت، یا ان کا کوئی افسر چیئرمین ہونے کے اختیارات تفویض کرے۔

اس دفعہ کے بجائے جماعت اسلامی پاکستان کی طرف سے پیش کردہ دفعہ درج ذیل ہے:

"(ا) مصالحتی یا ثالثی کونسل سے مُراد ایک ایسی مجلس ہے جو فریقین کے ایک ایک نمائندے پر مشتمل ہو۔

(ب) پریذائیڈنگ افسر سے مُراد ایک ایسی عدالتِ ماتحت کا پریذائیڈنگ افسر ہے جو مسلم عائلی تنازعات کے تصفیہ کی مجاز ہو۔

(ج) اپیلٹ کورٹ سے مُراد ڈویژنل اپیلٹ کورٹ ہے جسے عدالتِ ماتحت کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کے اختیارات دیئے گئے ہوں۔"

وراثت

آرڈی ننس کی دفعہ ۴ کی رُو سے اگر مورث کی زندگی میں اُس کا کوئی لڑکا یا لڑکی فوت ہو گئی ہو تو اس کی اولاد وراثت میں سے اتنا حصہ پائے گی جتنا کہ وہ لڑکا یا لڑکی زندہ ہونے کی صورت میں پاتے۔

جماعت کی تجویز یہ ہے کہ اس دفعہ کو حسبِ ذیل دفعہ سے تبدیل کر دیا جائے:

"مورث کی زندگی میں اُس کا کوئی لڑکا یا لڑکی فوت ہو جائے تو اُس کے جو وارث بھی مورث کی موت کے وقت زندہ ہوں، وہ مورث کی جائداد کا اُتنا حصہ پائیں گے جتنے حصے کی وصیت مورث نے اُن کے حق میں کی ہو، مگر یہ حصہ کل جائداد کے ایک تہائی سے زائد نہ ہو گا۔ اور اگر مورث نے کوئی وصیت نہ کی ہو تو اس صورت میں فوت ہو جانے والے لڑکے یا لڑکی کے وارث، مورث کے دوسرے ورثاء سے اُتنا نفقہ وصول کرنے کے حقدار ہوں گے جتنا کہ مسلم عائلی تنازعات کا تصفیہ کرنے والی عدالت تمام متعلقہ امور پر غور کرنے کے بعد اسلامی شریعت کے مطابق ان کے لیے تجویز

کرے لیکن یہ نفقہ اُس وصیت کی مقدار سے زائد نہ ہوگا جتنی وصیت کہ متوفی ان کے حق میں شرعاً کرسکتا تھا۔

نکاحوں کی رجسٹریشن

آرڈی ننس کی دفعہ ۵ کی رُو سے لازم ہے کہ ہر اس نکاح کی اطلاع نکاح رجسٹرار کو دی جائے جو خود نکاح رجسٹرار نے نہ پڑھایا ہو۔ یہ اطلاع دینا نکاح پڑھانے والے کی ذمہ داری ہے۔ خلاف ورزی کی صورت میں اس کے لیے تین ماہ کی قید محض یا ایک ہزار روپے تک جُرمانہ یا دونوں سزائیں ہیں۔

اس دفعہ کے بجائے جماعت کی تجویز کردہ دفعہ درجِ ذیل ہے:

"ہر وہ نکاح جو نکاح رجسٹرار نے نہ پڑھایا ہو، اس کی اطلاع نکاح خوان وقوعِ نکاح کے تین ماہ کے اندر اندر نکاح رجسٹرار کو دیگا۔ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے اُسے ایک سو روپیہ تک جرمانہ کی سزا دی جائے گی لیکن محض نکاح کا درج رجسٹر نہ ہونا نکاح کی صحت پر اثر انداز نہ ہوگا۔"

تعدُّدِ ازواج

آرڈی ننس کی دفعہ ۶ کی رُو سے سابق نکاح کی موجودگی میں کوئی شخص دوسرا نکاح نہیں کرسکتا، جب تک کہ وہ اپنی موجودہ بیوی یا بیویوں سے اس کی اجازت حاصل نہ کرے اور اس اجازت نامے اور نئے زیرِ تجویز نکاح کے وجوہ کو مصالحتی کونسل کے سامنے پیش کرکے اُس سے نکاح ثانی کی منظوری نہ لے لے۔ مصالحتی کونسل اگر چاہے تو اس منظوری کے ساتھ مزید شرائط بھی عائد کرسکتی ہے۔ جو شخص ایسی منظوری حاصل کیے بغیر نکاح کرے اُسے ایک سال تک کی قید محض یا ایک ہزار روپیہ تک جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔

اس دفعہ کے بجائے جماعت نے درج ذیل دفعہ پیش کی ہے:

(۱) اگر ایک شخص کی ایک یا ایک سے زیادہ بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے کسی کے ساتھ اسلامی شریعت کے مطابق "انصاف" نہ کرے تو جس بیوی یا جن بیویوں کی حق تلفی ہو، انہیں یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ عائلی تنازعات کی خاص عدالت سے کورٹ فیس کے بغیر چارہ جوئی کریں اور عدالت انہیں انصاف پر مجبور کرے گی۔

(۲) "انصاف" سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک بیوی ہو تو خاوند اس کا نان و نفقہ اور دیگر حقوق زوجیت ادا کرے اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے۔ اور اگر ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان سے جملہ امور مذکورۂ بالا میں یکساں برتاؤ رکھے۔

طلاق

"آرڈی ننس کی دفعہ ۷ یہ لازم کرتی ہے کہ جو شخص بھی اپنی بیوی کو طلاق دے، وہ اس کی تحریری اطلاع چیئرمین کو دے، ورنہ اُسے ایک سال تک قید یا پانچ ہزار روپیہ جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکیں گی۔ اِس تحریری نوٹس پر نوّے دن گزرے بغیر طلاق نافذ نہ ہو سکے گی۔ طلاق خواہ مغلّظ ہو یا غیر مغلّظ، چیئرمین اس نوٹس کے بعد تیس دن کے اندر اندر فریقین کے مابین مصالحت و مراجعت کے لیے ایک مصالحتی کونسل تشکیل دے گا اور یہ کونسل فریقین کے درمیان مصالحت کے لیے ہر ممکن تدبیر کرے گی۔ اگر بیوی حاملہ ہو تو جب تک وضعِ حمل یا نوّے دن، دونوں میں سے طویل تر مدت نہ گزر جائے طلاق نافذ نہ ہو گی۔ اس آرڈی ننس کی جملہ شرائط کے مطابق طلاق کو جب تک تین مرتبہ نافذ و مؤثر قرار نہ دیا جائے، مطلّقہ عورت اور طلاق دہندہ مرد کے مابین دوبارہ نکاح میں کوئی امر مانع نہ ہوگا اور سابق خاوند پر اس عورت کے حلال ہونے کے لیے یہ بھی ضروری نہ ہوگا کہ درمیان میں اس عورت کا نکاح کسی دوسرے مرد سے ہو۔"

جماعت کی تجویز یہ ہے کہ اس پوری دفعہ کو حذف کر دیا جائے اور اس کی جگہ صرف حسبِ ذیل الفاظ میں ایک دفعہ رکھ دی جائے:

(۱) "جو خاوند زبانی یا تحریری طور پر ایک ہی وقت اور ایک ہی نشست میں تین طلاق دے، اس کو مطلقہ کی شکایت پر ایک ہزار روپیہ تک جرمانہ یا اس کی عدم ادائیگی کی صورت میں تین ماہ تک قید محض کی سزا دی جائے گی، اس سے واجب الادا مہر بھی مطلقہ کو دلوایا جائے گا، اور نہ دے تو اسے حکومت کے عائد کردہ مالیۂ اراضی کی طرح وصول کیا جائے گا لیکن مسلمانوں کے جو فرقے اپنی فقہ کی رُو سے اس طرح کی تین طلاق کو طلاقِ مغلّظہ قرار دیتے ہیں، ان کے حق میں یہ طلاق مغلظہ (یعنی غیر رجعی) ہی شمار ہو گی۔

(۲) جو شخص مذکورۂ بالا طریق پر طلاق کی دستاویز تحریر کرے گا یا اس پر شہادت دیگا، اُسے مندرجۂ بالا جرم میں اعانت کا مجرم قرار دے کر سزا دی جائے گی۔"

تفویضِ طلاق و تفریقِ زوجین

آرڈی ننس کی دفعہ ۸ یہ لازم کرتی ہے کہ اگر شوہر بیوی کو حق طلاق تفویض کر دے، اور بیوی اس حق کو استعمال کرنا چاہے یا زوجین کسی دوسرے طریق پر تفریق چاہیں، تب بھی وہ ان تمام قواعد و ضوابط کی پابندی کریں جو اوپر دفعہ ۷ میں بیان ہوئے ہیں۔

اس کی جگہ پر جماعت کی طرف سے یہ دفعہ پیش کی گئی ہے:

"اگر خاوند نے بیوی کو حقِ طلاق تفویض کر دیا ہو، تو وہ اپنی مرضی کے مطابق کسی سے رجوع کیے بغیر اور کسی سے اجازت لیے بغیر آزادانہ طور پر یہ حق استعمال کر سکتی ہے۔"

نان و نفقہ

آرڈی ننس کی دفعہ ۹ کا منشا یہ ہے اگر خاوند اپنی بیوی یا بیویوں کو مناسب اور

منصفانہ نان و نفقہ نہ دے تو وہ بیوی یا بیویاں دیگر قانونی چارہ جوئیوں کے علاوہ چیرمین سے درخواست کر کے ایک ثالثی کونسل بنوا سکتی ہیں جو ایک متعین مقدار کے نان و نفقہ کا سرٹیفکیٹ جاری کر سکتی ہے۔ اس سرٹیفکیٹ پر نظرِ ثانی کے لیے کلکٹر یا ایس ڈی او سے درخواست کی جا سکتی ہے، جس کا فیصلہ قطعی ہوگا اور جس کے خلاف کسی عدالت میں کارروائی نہ ہو گی۔"

اس دفعہ کے بجائے جماعت کی تجویز کردہ دفعہ درجِ ذیل ہے:

"اگر ایک خاوند اپنی بیوی یا بیویوں کو مناسب اور منصفانہ نان و نفقہ نہ دے تو جس بیوی کو شکایت ہو وہ علاوہ اُس چارہ جوئی کے جو وہ ضابطۂ فوجداری پاکستان کی دفعہ ۴۸۸ کے تحت کر سکتی ہے، یہ حق بھی رکھتی ہے کہ مسلم عائلی تنازعات کے لیے مخصوص عدالت کے پریزائیڈنگ افسر سے درخواست کرے جس پر وہ ایک ثالثی کونسل تنازعے کے تصفیہ کے لیے مقرر کرے گا اور اس کی ناکامی کی صورت میں تنازعہ کا خود فیصلہ کرے گا اور خاوند کے ذمے واجب الادا نان و نفقہ کا سرٹیفکیٹ جاری کرے گا۔

(۲) اس سرٹیفکیٹ کے خلاف خاوند یا بیوی متعین طریق پر اور متعین مدّت کے اندر ڈویژنل اپلیٹ کورٹ برائے تصفیہ عائلی تنازعات میں نظرِ ثانی کی درخواست دے سکیں گے۔ اس کا فیصلہ قطعی ہو گا جس کے خلاف کسی عدالت میں چارہ جوئی نہ ہو سکے گی۔

عدالتی نظام برائے فیصلہ عائلی تنازعات

"آرڈی ننس کی دفعہ ۱۱ کے تحت صوبائی حکومت کو اختیار دیا گیا ہے، کہ وہ آرڈی ننس کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مختلف قواعد و ضوابط بنائے، (چنانچہ اس کے تحت صوبائی حکومت نے یونین کونسلوں اور عائلی عدالتوں کو عائلی مقدمات کے تصفیہ کا مجاز بنایا ہے)۔

اس دفعہ کے بجائے جماعت اسلامی کی طرف سے دفعاتِ ذیل پیش کی گئی ہیں:

"(۱) وراثت کے مقدمات کے ماسوا تمام تنازعات جن کا تصفیہ مسلم فیملی لاز آرڈیننس ۱۹۶۱ کے تحت تجویز کیا گیا ہے، ان کے لیے عدالتہائے تصفیہ برائے مسلم عائلی تنازعات (MUSLIM FAMILY DISPUTES SETTLEMENT COURTS) کے نام سے خاص عدالتیں درج ذیل طریق پر قائم کی جائیں:

(ا) پاکستان کی تحصیل یا سب ڈویژن میں ابتدائی سماعت کے لیے ایک ماتحت عدالت قائم کی جائے۔

(۲) شق (ا) کے مطابق جو عدالت ماتحت قائم ہو، اس کی صدارت پر ایسا شخص فائز ہو جو ذیل کی صفات سے متصف ہو:

(ا) وہ لازماً مسلمان ہو،

(ب) وہ شریعتِ اسلامی، بالخصوص مسلم شخصی قانون کا ضروری علم رکھتا ہو،

(ج) وہ لازماً ایک سن رسیدہ شخص ہو جس کی عمر پینتالیس ۴۵ سال سے کم نہ ہو، اور اخلاق و سیرت کی پختگی اور اسلامی طرز کی زندگی بسر کرنے میں شہرت رکھتا ہو۔

(۳) اس طرح تشکیل شدہ عدالتیں سرکٹ کورٹس کی طرح کام کریں اور اپنے حدودِ اختیار پر مشتمل پورے علاقے میں دورہ کریں۔ یہ عدالتیں فریقین اور ان کے مسلم نمائندوں کے زبانی بیانات کی سماعت کر سکیں گی اور فریقین پر کوئی فیس عائد نہ ہو گی۔

مزید شرط یہ ہے کہ یہ عدالتیں عائلی تنازعات کے تحت آنے والے مقدمات کی کارروائی کے آغاز سے قبل اس امر کی مجاز ہوں گی کہ فریقین تنازعہ کو حکم دیں کہ وہ اپنے اپنے کنبے سے ایک ایک نمائندہ ثالثی کونسل کی تشکیل کے لیے نامزد کریں جو پندرہ دن کے اندر اندر مصالحت کی کوشش کریگی اور اس کے نتائج کی تحریری رپورٹ صدرِ عدالت کو دے گی۔ اگر ثالثی کونسل مصالحت میں ناکام رہے یا فریقین یا ان میں سے کوئی ایک نمائندہ نامزد نہ کرے، تو صدرِ عدالت فریقین و گواہان کے

بیانات اور شہادتیں سننے اور ریکارڈ کا ملاحظہ کرنے کے بعد جس قدر عجلت کے ساتھ ممکن ہو، تنازعے کا فیصلہ کردے گا۔

(۴) اپیلیٹ کورٹ کا صدر لازمًا ایسا شخص ہوگا:

(۱) جو مسلمان ہو،

(ب) جو عربی زبان اور اسلامی شریعت کا ضروری علم رکھتا ہو اور مسلمانوں کے شخصی قوانین کے نفاذ یا تعلیم وتدریس کا کم ازکم پانچ سال کا تجربہ رکھتا ہو،

(ج) جس کی عمر پچاس سال سے زائد ہو اور جو سیرت واخلاق، تقویٰ اور کتاب وسنت کے مطابق اسلامی طرزِ حیات کی پابندی میں معروف ہو۔"

قانونِ نکاحِ صغار

آرڈی ننس کی دفعہ ۱۲ کی رُو سے سولہ برس سے کم عمر کی لڑکی کو صغیرہ قرار دیا گیا ہے جس کا نکاح قانون نکاحِ صغار ۱۹۲۹ء کے تحت جرم مستلزم سزا ہے۔

اس کے بجائے جماعت کی طرف سے درج ذیل دفعہ تجویز کی گئی ہے۔

"(۱) ۱۹۲۹ء کے قانون نکاح یا کسی دوسرے قانون، آرڈی ننس، ریگولیشن یا رولز کے باوجود ایک سرپرست کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے زیر سرپرستی کم سن لڑکے یا لڑکی کا نکاح مسلم عائلی تنازعات کی عدالت سے منظوری لے کر کر دے۔

(۲) عدالتِ مذکور ایسے نکاح کی معقول ضرورت کے بارے میں اطمینان کرلینے کے بعد نکاح کی اجازت دینے کی مجاز ہوگی۔

(۳) عدالت جب بھی اس طرح نکاح کی اجازت دیگی تو اس کے ساتھ اس امر کا سرٹیفکیٹ بھی دیگی کہ تمام متعلقہ افراد قانونِ پابندیٔ نکاحِ صغار ۱۹۲۹ء کی زد سے بری وآزاد ہیں۔

لیکن مندرجہ بالا شقیں ان شرائط کے ساتھ مشروط ہیں کہ:

(الف) اجازت کا اطلاق صرف انعقادِ نکاح پر ہوگا۔ رخصتی بلوغ سے پہلے نہ ہو سکے گی۔ (ب) جو نکاح اسلامی شریعت میں جائز ہو اور قواعدِ شرعیہ کے مطابق منعقد ہوا ہو وہ محض اس وجہ سے فاسد یا باطل نہ ہوگا کہ وہ اس آرڈی ننس یا ۱۹۲۹ء کے قانونِ نکاح کے قواعد وضوابط کے خلاف ہے۔"

اِسلام کے تاریخی ارتقاء کی نوعیّت

پروفیسر عبد الحمید صدیقی

جس طرح ایک ہی منبع سے جاری ہونے والے دریا اپنی گزرگاہوں کی نوعیتوں میں اختلاف کی وجہ سے اپنی رفتار، اپنی وسعت اور اثرات میں ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح ایک ہی سرچشمہ سے پھوٹنے والے ادیان ماحول اور تاریخی عوامل کے فرق کی وجہ سے روح اور مزاج کے اعتبار سے نہ سہی، مگر دائرۂ عمل کے لحاظ سے ضرور ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ کسی مذہب کے اندر تجدید و احیائے دین کی کوئی تحریک لے کر اٹھے ہوں انہیں ان تاریخی عوامل اور ارتقاء کے اس نہج پر پوری طرح نگاہ رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اس پس منظر کو ذہن نشین کیے بغیر تجدید کی نازک ذمہ داریوں کو کماحقہٗ سمجھا نہیں جا سکتا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم یہاں ایک امر کی وضاحت نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ یُوں تو زندگی کا ہر نظام مختلف اقدار کے باہمی امتزاج سے معرضِ وجود میں آتا ہے، لیکن مذہب کا تو سارا دارومدار ہی اس امتزاج کے ایک خاص تناسب پر ہے۔ اس تناسب میں معمولی سی تبدیلی مذہب کے پُورے نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے، اسلامی نظامِ حیات کا کونسا شعبہ ایسا ہے جس کے واضح نقوش دوسرے نظام ہائے حیات میں نہیں ملتے۔ کسبِ معاش کی ترغیب، خرچ کے معاملے میں احتیاط کی ہدایت، والدین، بیوی، اولاد اور پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے کی تلقین، اپنے جسم کے تقاضوں کو یکسر نظرانداز کرنے کی ممانعت، غرض زندگی کا وہ کونسا ایسا شعبہ ہے جس کا کوئی نشان غیر اسلامی تہذیب میں نہ پایا جاتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود اسلامی نظامِ حیات اور غیر اسلامی تمدنوں کے درمیان ہم بنیادی

اور اساسی فرق دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مظاہر حیات میں مماثلت روح اور مزاج کی ہم آہنگی پر ہمیشہ دلالت نہیں کرتی۔ صرف چند گوشوں میں اشتراک کے بعض پہلو دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ روح کے اعتبار سے بھی ایک ہی ہیں۔ ایک تہذیب کو جو چیز دوسری تہذیبوں سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے وہ اس کے مظاہر نہیں ہوتے بلکہ اُس تہذیب کا وہ نظامِ اقدار ہے جو وہ اپنے اساسی تصور اور اپنی مخصوص رُوح اور مخصوص مزاج کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کے درمیان ایک خاص نہج پر قائم کرتی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ دو تہذیبوں کے بعض مظاہر ایک دوسرے سے ملتے ہوئے نظر آئیں۔ لیکن اگر ان تہذیبوں کے اساسی تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو رُوح اور مزاج کے اعتبار سے اُن میں کبھی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جس بنیادی تصور کے رُخِ زیبا کے یہ عکس ہیں اُس میں بُعد اور بیگانگی پائی جاتی ہے۔ آپ کسبِ معاش ہی کو لیجیے اور دیکھیے کہ اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان معاشی جدوجہد کے بعض پہلوؤں میں بظاہر اشتراک ہونے کے باوجود مقصد اور دائرۂ کار میں کتنا بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مغربی تصور کے مطابق اس جدوجہد کی غایت صرف اسی قدر ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ دولت کمائی جائے۔ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ جدوجہد عبادت کے زُمرے میں داخل ہے اور اس کا منتہائے مقصود باری تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔ اِس لیے اس دائرۂ عمل میں وہ بعض اخلاقی حدود کا پابند ہے۔

ان گزارشات سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی ہوگی کہ کسی تہذیب کا مدار اُس کے مظاہر پر نہیں ہوتا بلکہ اُس کی رُوح اور اُس کے اُس نظامِ اقدار پر ہوتا ہے جس کے مطابق اُس کے مختلف شعبوں کے درمیان ربط پیدا کیا جاتا ہے۔ اس لیے تجدید و احیائے دین کے علمبرداروں کو اس نظامِ اقدار کے معاملے میں غیر معمولی حد تک محتاط ہونا چاہیے، کیونکہ اگر انہوں نے مختلف تہذیبوں کے مظاہر میں یگانگت پاکر تہذیبی رُوح کے فرق سے قطع نظر کرتے ہوئے کسی دوسری تہذیب کے طریقوں کو اختیار کر لیا تو اس سے اقدار کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور ان ستونوں کے گرنے سے تہذیب کی پوری عمارت پیوندِ خاک ہو جائے گی۔

اگر آپ مسلمانوں میں پھیلی ہوئی فکر و عمل کی مختلف گمراہیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ساری بُرائیاں ہماری اسی غفلت کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں سرایت کرتی چلی جا رہی ہیں ۔ ہم نے جہاں کہیں دوسرے نظامِ حیات میں کوئی ایسی چیز دیکھی جس کی کوئی صورت ہمارے ہاں بھی پائی جاتی تھی تو اسے جُوں کا توں اپنانے کی کوشش کی ، اور اگر اس راہ میں قرآن و حدیث کے واضح احکام بھی حائل ہوئے تو انہیں یا تو نظر انداز کر دیا یا ان کی ایسی تاویل پیش کی جس سے وہ اُن کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کے مخالف ہونے کے بجائے اُن کے مؤید ہو جائیں اگر آپ ان سطحی اور ذہنی اعتبار سے مغلوب لوگوں کے کارناموں پر نگاہ ڈالیں تو آپ کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہ ہو گا کہ انہوں نے تجدید و احیائے دین کے نام پر دین کے ساتھ دانستہ یا نادانستہ ایک ایسا شرمناک کھیل کھیلا جس سے وہ انسانیت کے لیے نورِ ہدایت ثابت ہونے کے بجائے مُرغِ بادنما بن کر رہ گیا جسے غیر اسلامی افکار و نظریات کے تھپیڑے ہر وقت اپنی منشا اور مرضی کے مطابق گھماتے رہیں ۔ یہ تو محض اللہ کا احسان ہے کہ علمائے ربّانی نے ان تجدد پسندوں کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا ، ورنہ آج اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہونے کے بجائے اسی طرح کا ایک بے جان اور غیر مؤثر ضمیمۂ زندگی ہوتا جس طرح مسیحیت ، یہودیت ، بدھ مت ، ہندو مت یا اس طرح کے بعض دوسرے مذاہب ہیں

ماضی میں اِن تجدد پسندوں نے کن باطل افکار کو اسلام میں داخل کرنے کی کوششیں کیں اور کس طرح اللہ کے پاکباز بندوں نے اُن کی ان مذموم کوششوں کو ناکام بنا دیا ، یہ ایک طویل داستان ہے جسے یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ ہم یہاں بطورِ مثال دَورِ جدید کی بعض کوششوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے تجدد پسندوں کے اندازِ فکر اور دین کے لیے اُس کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

ہمارے ہاں جس عہد میں مغربی تہذیب کا ریلا آیا اس وقت یورپ میں سائنس کو بڑا عروج حاصل تھا ۔ فطرت کو لوگ خدا سمجھ کر اس کی بارگاہ میں جبینِ نیاز جھکا رہے تھے ۔ اس کے اکتشافات پر انہیں اتنا ہی غیر متزلزل یقین تھا جتنا کہ کسی خدا پرست کو وحی و الہام پر ہوتا ہے ۔ اُس کے

قوانین کو وہ قوانینِ شریعت سے زیادہ صحیح اور مستحکم سمجھتے تھے۔ چنانچہ ہماری ملت کے وہ افراد جو غالب تہذیب سے مرعوب تھے انہوں نے انفس و آفاق پر غور کرنے کی قرآنی دعوت کو، اور بعض مسلمان سائنس دانوں کے کمالات کو دلیل بنا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلام قوانینِ فطرت کی پابندی ہی کا دوسرا نام ہے اور اس کے نتیجے میں ہر اس چیز کی نفی کر دی جو ان قوانین سے ہم آہنگ نہ تھی معجزات، وحی، فرشتے، جن، دوزخ، جنت، حشر و نشر، غرض وہ سارے عقائد جن کی تائید مشاہدہ اور تجربہ سے نہ ہو سکتی تھی، اُن کا یا تو واضح طور پر انکار کر دیا گیا یا اُن کی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی گئی جو صریح طور پر تحریف کے ذیل میں آتی ہے۔

اسی طرح جب مغرب میں سرمایہ داری کو فروغ حاصل ہُوا اور اس کی توسیع و ترقی کے لیے جمہوری فضا مہیا کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو ہمارے تجدد پسند طبقوں نے اس حقیقت کو سوچے بغیر کہ یہ مغربی جمہوریت کس روح کی مظہر ہے، اور اس کے پیچھے کس نوعیت کے لادینی تصورات کارفرما ہیں، اور اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں کیا بنیادی اختلافات ہیں، یہ کہنا شروع کر دیا کہ مغرب کا جمہوری نظام، جس میں پُورا معاشرہ چند افراد کے مفادات پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے، اسلام کے سیاسی نظام کا ایک چربہ ہے۔ یہی مرعوبانہ ذہنیت ہمیں بہت سے دوسرے معاملات، مثلاً سُود، انشورنس، ضبطِ ولادت، تعددِ ازدواج اور اسی طرز کے سینکڑوں مسائل میں نظر آتی ہے۔ اسلام نے کاروبار میں منافع کے لیے جو جواز رکھا ہے اُسے آڑ بنا کر سُود کو جائز بنانے کی کوشش کی گئی۔ آفاتِ ناگہانی کے معاملے میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری، اور بے یار و مددگار افراد کی کفالت کے اسلامی تصور پر انشورنس کے جواز کا فتویٰ دیا گیا۔ یہ تھا وہ انداز جس کے تحت مغربی تہذیب کا اسلامی نظامِ حیات میں پیوند لگانے کی باقاعدہ جدوجہد ہوئی۔

لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ تجدد پسندوں کے غیر معمولی وسائل، مغربی تہذیب کی چکاچوند روشنی، اور اسلامی تمدن کے اضمحلال کے باوجود ان لوگوں کو اپنے مقصد میں قطعاً کامیابی نہ ہوئی اور امت کے اجتماعی ضمیر نے ان لوگوں کے اجتہادات کو ایک لمحہ کے لیے قبول کرنا

قودرکناران پر سوچنا تک گوارا نہ کیا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر تاریخ کے ایک طالب علم کے ذہن میں بالکل قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تجدّد پسندوں کے فتنوں سے دوسرے مذاہب نہ بچ سکے اور غالب تہذیبوں کے نہ صرف اجزا بلکہ ان کی رُوح تک اُن میں شامل ہوگئی جس نے ان مذاہب کی امتیازی حیثیت کو ختم کر کے رکھ دیا، تو اسلام آخر ان "مصلحین" کی دستبرد سے کیونکر محفوظ رہا؟

اس کا ایک سیدھا سادھا جواب تو یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے اس لیے کسی فتنہ جُو کی فتنہ سامانی اس کے اندر کوئی رخنہ نہیں پیدا کر سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ باری تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھنے کے لیے کچھ خاص اسباب بھی پیدا کیے ہیں۔ ان صفحات میں ہم انہی اسباب کی نشاندہی کریں گے۔

اسلام کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں دونوں مرکزِ نقل یعنی کتاب اللہ اور جس مقدس اور برتر ہستی پر یہ کتاب نازل ہوئی تھی اور جسے اس کی عملی تعبیر کے لیے باری تعالیٰ نے بطور نمونہ پیش کیا تھا، اُس کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک گوشہ اور اُس کی پیش کردہ تصریحات کا ایک ایک حرف پُوری طرح محفوظ ہے۔ یہ امتیاز کسی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں۔ اول تو اُن کے صُحفِ آسمانی کے متعلق یہ بات ہی یقین اور وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ یہ ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے یکسر پاک ہیں۔ کیونکہ اُن میں کافی حد تک آمیزش موجود ہے اور بعض الہامی کتب ایسی بھی ہیں جن کا اصل متن ہی غائب ہے اور سارا انحصار محض تراجم پر کیا جا رہا ہے۔ پھر خدا کے جن پاک بندوں پر یہ الہامی کتابیں نازل ہوئی تھیں، اُن کی زندگی کے بہت سے پہلو ہماری نظر سے مستور ہیں۔ اس کے علاوہ جو پہلو معلوم و معروف ہیں اُن کے بارے میں بھی قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُس میں قیاسات اور لکھنے والے کے ذاتی میلانات کا بڑا عمل دخل ہے۔ دنیا کی کوئی دوسری ایسی قوم نہیں گزری جس نے اپنے پیغمبر اور ہادی کی پُوری زندگی کو اُس اہتمام سے محفوظ کیا ہو جس طرح کہ مسلمانوں نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو

محفوظ کیا ہے۔

سیدنا مسیح علیہ السلام کے پرستاروں کی دنیا میں کتنی کثیر تعداد موجود ہے لیکن آج تک وہ اُن کی سیرت کا کوئی ایسا مرقع پیش نہیں کر سکے جو تاریخی اعتبار سے مستند بھی ہو اور جامع بھی۔ اِس حقیقت کا اعتراف خود مسیحیت کے گرم جوش علمبردار ونگ نے کیا ہے:

"ہمارے سامنے حضرت مسیح علیہ السلام کی پاکیزہ زندگی کے ایک حصے کے بھی صرف چند ہی پہلو بے نقاب ہوتے ہیں۔ تین سال کی بھرپور زندگی جس کی تیاری میں تیس سال صرف ہوئے، اس کی کون پردہ کشائی کر سکتا ہے۔ ہم اس ذات کے بارے میں صرف اسی قدر واقفیت رکھتے ہیں کہ اُس کی وجہ سے ایک تہائی دنیا روحانی اعتبار سے بیدار ہوئی، اور اب بھی اُس کے حیات آفریں اثرات موجود ہیں اور رہیں گے ——— ایک مثالی زندگی جس سے ہم بہت قریب ہونے کے باوجود دُور ہیں لیکن اس مقدس زندگی کا کتنا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں ہمیں کچھ معلومات ہیں؟ مثلاً اُن کی والدہ محترمہ کے حالات، اُن کی گھریلو زندگی، اُن کے بچپن کے ساتھی اور اُن کے ساتھ اُن کے تعلقات۔ اُن کے روحانی مشن کے تدریجی طلوع یا یک بیک ظہور کی نسبت بھی ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے۔ ہمارے ذہن میں اُن مسائل کے متعلق کتنے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جو لاینحل ہی رہتے ہیں اور ہمیں ان کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔ مگر اسلام میں ہر چیز ممیز اور ممتاز ہے۔ یہاں کوئی دھندلا پن اور راز نہیں۔ . . . یہاں دن کا اُجالا ہے جس میں ہر چیز روشن ہے اور جس سے ہر فرد مستفیض ہو سکتا ہے[1]"۔

مسلمانوں نے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات جس حزم و احتیاط سے جمع کئے اور اس معاملے میں جو کاوش انہوں نے کی اُس کی نظیر دنیا کی مذہبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انہوں نے

---

[1] BOSWORTH SMITH, MOHAMAD AND MOHAMMADANISM

واقعات کو قلمبند کرنے کے لیے یہ اشد ضروری سمجھا کہ سب سے پہلے ان واقعات کے راویوں کے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے۔ اس کے لیے سب سے پہلا اصول یہ پیش نظر رکھا گیا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام درمیانی کڑیوں کی نام کی تصریح کے ساتھ صراحت کی جائے۔ اس کے ساتھ اس بات کی بھی پوری طرح چھان بین کی جائے کہ جو حضرات سلسلۂ روایت کی مختلف کڑیوں کو ملا رہے ہیں وہ کیسے ہیں۔ دیانت اور امانت میں اُن کا کیا معیار تھا؟ اُن کے مشاغل کیا تھے؟ اُن کا چال چلن کیا تھا؟ سمجھ بوجھ اور فہم و ادراک کیسا تھا؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ عالم تھے یا جاہل؟ اتنی چھوٹی چھوٹی جزئیات تک کا پتہ لگانا کسی اعتبار سے بھی جوئے شیر لانے سے کم صبر آزما کام نہ تھا۔ لیکن سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اس کام میں صرف کر دیں ایک ایک شہر میں گئے، ایک ایک گاؤں میں گھومے، جگہ جگہ ایسے افراد کو تلاش کیا جو حضور سرور کائنات کے بارے میں کوئی مستند بات اپنے پاس رکھتے ہوں۔ پھر خود اُن کے متعلق بھی ہر قسم کے حالات دریافت کیے تاکہ ان کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکے۔

یہ خدا کے اُن پاکباز بندوں کی سعی و جہد ہی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان فن ایجاد ہوا جس کی کوئی دوسری مثال ہمیں تاریخِ عالم میں نہیں ملتی۔ مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر، جس کی نگرانی میں حافظ ابن حجر کی مشہور کتاب اصابہ فی احوال الصحابہ طبع ہوئی، نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے:

> "کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری اور نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ افراد کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

ایک طرف قرآن مجید کے پورے متن کی جس میں نہ صرف الفاظ بلکہ حروف او شوشے تک شامل ہیں، مکمل حفاظت، اور دوسری طرف حضور سرورِ کائنات کی حیاتِ طیبہ کے

مستند ریکارڈ کی موجودگی، یہی دو چیزیں وہ ہیں جنہوں نے اسلام کو ہر قسم کے فتنے سے بچایا ہے
میری ان گزارشات کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام پر فتنہ پردازوں نے یورش نہیں کی۔ اللہ
کے دین پر مفسدین نے بڑے منظم حملے کیے اور بسا اوقات دین کے بعض خیر خواہوں نے
حالات سے متاثر بلکہ مرعوب ہو کر دین میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی کوششیں کیں جن کے ذریعہ
اُن کی دانست میں یہ وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جائے۔ لیکن کتاب اللہ اور
سنت رسول اللہ کی موجودگی میں نہ تو مفسدین کی کوششیں بار آور ہو سکیں اور نہ نیک نیت
تجدد پسندوں کو اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نصیب ہوئی۔ قرآن حکیم اور سنتِ نبوی نے
زبردست حصار کا کام دیا اور کسی فتنے کو اسلام کے اندر راہ پانے کا موقع نہ مل سکا۔ مارٹن لوتھر
سے کہیں زیادہ ذہین وفطین، اس سے کہیں بڑھ کر جوش اور ولولہ رکھنے والے انسان، حکومت کی
سرپرستی کے باوجود اسلام میں کوئی معمولی سا تغیر و تبدل بھی پیدا نہ کر سکے۔ اگر آپ کو ان حضرات
کی ناکامیوں کا جائزہ لینا مقصود ہو تو آپ صرف چند پہلوؤں پر غور کر کے دیکھیں کہ انہیں
کس قدر شکست فاش کھانی پڑی ہے۔

یورپ میں جب سرمایہ داری کا عروج ہوا تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ یہ نظام
سود کے بغیر کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اہلِ کلیسا نے اس کے جائز ہونے کا فتویٰ صادر
کر دیا اور اہلِ یورپ نے اُسے شرح صدر کے ساتھ اپنا لیا۔ اور یہ چیز اُن کے خمیر میں اب اس
طرح داخل ہو گئی ہے کہ انہیں کبھی اس بات کی خلش تک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اس حرام شے
کو کھا رہے ہیں جسے ان کا دین بھی حرام کہتا ہے۔

اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے معاملے کو دیکھیے تو آپ کو بالکل مختلف صورتِ حال
نظر آئے گی۔ مسلمانوں کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو گا جو سود کی لعنت سے بالکل محفوظ ہو۔
ان ممالک کے تاجروں اور صنعت کاروں کی عظیم اکثریت بنکوں کے ذریعہ تجارت کرتی اور
کاروبار چلاتی ہے۔ ان کی حکومتیں بھی سود پر اپنا سارا مالی نظام چلاتی ہیں۔ مغربی تہذیب کی

یلغار نے ان کے اندر یہ عزم اور ہمت ہی نہیں چھوڑی کہ وہ اس کے اثرات کو نظر انداز کر کے کوئی ایسا معاشی نظام قائم کر سکیں جس میں سُود کا کوئی عنصر شامل نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے جو حوصلہ جو حکمت و اجتہاد، جو مومنانہ فراست اور اسلام سے جو والہانہ محبت درکار ہے، وہ اُن حضرات میں بالکل مفقود نظر آتی ہے جو مسلمان ملکوں میں اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لیے قوت اور وسائل رکھتے ہیں۔

مزید براں خود مسلمانوں کے اندر ایک نہیں، متعدد ایسی نامور شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے سُود کے بارے میں مسلمانوں کے احساسات اور تصورات کو بدل ڈالنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ اُن میں اصحابِ علم، سیاستدان، رہنما اور ملت کے بڑے بڑے دردمند شامل ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ یہ وہ سُود ہے ہی نہیں جسے اسلام نے حرام کیا ہے لہٰذا اسے بطیبِ خاطر قبول کر لینا چاہیے۔ کسی نے دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان تفریق کی بنیاد پر متحدہ ہندوستان میں سُود کے جواز کا فتویٰ دیا۔ کسی نے یہ کہہ کر اسے حلال قرار دیا کہ کاروباری ضروریات کے لیے جو روپیہ لیا جائے اُس پر منافع کی مقرر شرح سُود کے ذیل میں سرے سے آتی ہی نہیں۔ کسی نے مسلمانوں کی مفلسی اور غربت کے پیشِ نظر اسے اضطرار کے زمرے میں شامل کر کے اس کے لینے اور دینے کے لیے قوم کو کھلی چھوٹ دینے کی کوشش کی لیکن ان سب حضرات کی کوششیں بالکل رائیگاں گئیں۔ امت کے اجتماعی ضمیر نے آج تک اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ سُود کا موجودہ نظام جائز ہے اور اسے اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ مسلمانوں کی ۹ء۹۹ فیصد آبادی اُسے آج بھی اُسی طرح حرام سمجھتی ہے جس طرح کہ خود شارع علیہ السلام نے اُسے حرام قرار دیا تھا۔

سُود تو خیر بڑی چیز ہے۔ تصویر جس سے آج مسلمان ممالک کے بیشتر اخبارات مزین ہیں، جس کے بغیر کوئی اشتہار مکمل نہیں ہوتا، جو ہماری زندگی کے اندر ایک ضروری عنصر کی حیثیت سے داخل ہو گئی ہے، اس کے بارے میں بھی اگر آج مسلمانوں کے ضمیر کو ٹٹولا جائے تو

معلوم ہوگا کہ وہ اسے کوئی پسندیدہ چیز نہیں سمجھتا بلکہ ایک ایسی برائی خیال کرتا ہے جسے اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے، لیکن محض غفلت کی وجہ سے مسلمان اُس میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

آپ مسلمانوں کو بدعملی اور غفلت کے جس قدر طعنے دیں آپ حق بجانب ہیں لیکن اس بدیہی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم قوم کے احساسات اُس کے خوب و ناخوب کے پیمانوں، اُس کے حلال و حرام کے امتیازات، اور نیکی اور بدی کے تصورات میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ جن چیزوں کو اُس کے ہادی برحق نے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ وہ آج بھی اُس کی نظر میں ناپسندیدہ ہیں اور کوئی فلسفہ، کوئی منطقی استدلال، کسی بڑے سے بڑے نامور مفکر کی رائے، مسلمانوں کی فکر و نظر کے زاویوں یا اُن کے اجتماعی احساسات کو بدل نہیں سکی۔

اسلام کے اس روشن اور امتیازی پہلو پر آپ جتنا زیادہ غور کریں گے اتنی ہی یہ حقیقت منکشف ہوتی چلی جائے گی کہ اسلامی نظامِ حیات کی زندگی اور اُس کی پائیداری کا سب سے بڑا راز اس بات میں مضمر ہے کہ مسلمانوں کے پاس اللہ کی کتاب اور اُس کے رسول کی سنت جوں کی توں محفوظ ہیں۔ اگر محض کتاب الٰہی ہوتی اور سنتِ رسول موجود نہ ہوتی تو پھر یہ بات عین ممکن تھی کہ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی من مانی تاویلات کے دروازے کھل جاتے۔ لیکن سنت نے ان سارے دروازوں کو مسدود کر دیا ہے، کیونکہ مسلمان کے نزدیک قرآن مجید کی کوئی ایسی تشریح قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جس کی تائید سنتِ نبوی سے نہ ہوتی ہو۔ یہی اسلامی تہذیب و تمدن کا سب سے نمایاں اور امتیازی پہلو ہے اور غالباً اسی وجہ سے مستشرقین تک اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ خود کفیل اور جامع تہذیب ہے۔

پاکستان کا مطلوب شہری اور نظامِ تعلیم

عبد الحمید صدیقی

[ایک مقالہ جو اشاعتِ تعلیم کالج لاہور کے یومِ والدین میں ۵ رجون کو پڑھا گیا۔]

صاحبِ صدر اور معزز حضرات!

عام طور پر کوئی ایسا ملک جو نیا نیا دنیا کے سینے پر ابھرا ہو اپنے سامنے بلاشبہ یہ پیچیدہ مسئلہ رکھتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لیے فکر و نگاہ کے کونسے زاویے اور عمل کے کونسے میدان متعین کرے۔ اور اسی طرح ایک نئی قوم کے لیے بھی یہ سوال کافی پریشان کن ہوتا ہے کہ وہ اپنے افراد کو کس مقصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل کرے کسی دوسرے ملک اور دوسری قوم کے لیے یہ دونوں سوالات شدید اضطراب کا باعث بن سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے لیے یہ دونوں سوالات سرے سے کسی پیچیدگی کے حامل نہیں۔ ہم انہیں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے بہت پہلے طے کر چکے ہیں بلکہ پاکستان انہی پریشانیوں اور اضطرابات کو دُور کرنے کے لیے ہی تو معرضِ وجود میں آیا تھا۔

مسلمانوں کے اندر صدیوں سے یہ چھپتا ہُوا احساس موجود چلا آرہا ہے کہ اُن کی حیاتِ اجتماعی اُس خاکے اور نقشے کے مطابق نہیں ہے جو ہمیں اسلام نے دیا ہے اور جس کے عملی مظہرات ہمیں سنتِ رسول اور آثارِ صحابہ میں ملتے ہیں۔ آپ مسلمانوں کی کسی انقلاب انگیز تحریک کا جائزہ لیں، آپ کو اس کے پیچھے یہی احساس کار فرما نظر آئے گا۔ مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات، شاہ ولی اللہ اور اُن کے فرزندانِ ارجمند کے افکار و نظریات، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ

اور سید احمد بریلویؒ کی تحریکِ جہاد، دیوبند اور ندوہ کی تعلیمی سرگرمیاں، تحریکِ خلافت، مولانا شبلیؒ، حالیؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار و تصورات، غرض ان سب فکری اور عملی کوششوں میں یہی احساس جاری و ساری نظر آتا ہے۔ بلکہ خود تحریکِ پاکستان بھی اسی احساس کی مظہر ہے۔

برِعظیم ہند ہی کے نہیں، پوری دنیا کے لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لیے ایک الگ خطّۂ ارضی کا مطالبہ صرف اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ اپنی الگ اور مستقل تہذیب کا شعور رکھتے تھے اور ان اجتماعی تخیلات اور معاشرتی افکار کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے جن سے ہندوستانی وطنی تحریک کا مزاج تیار ہوا تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو مسلمانوں کے لیے اس میں کیا قباحت تھی کہ وہ بھی عیسائیوں، پارسیوں اور سکھوں کی طرح ایک محدود معنی میں اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ہندوستانی قومیت کا جزو بننے پر راضی ہو جاتے۔ آخر اس میں کیا چیز مانع تھی کہ مسلمان اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی رسوم و عبادات اور بعض معاشرتی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے امورِ مملکت کے انصرام اور نظمِ اجتماعی کی تشکیل میں ہندوؤں سے پورا پورا اشتراکِ عمل کر لیتے اور اس ملک کا بٹوارا نہ ہوتا۔ کانگرس کا استدلال یہی تو تھا کہ جب تم اپنی مذہبی آزادی برقرار رکھ کر بھی ہندوستانی قومیت میں شامل ہو سکتے ہو تو پھر مذہبی اساس پر ایک علیحدہ قومیت کا ادعا کیوں کرتے ہو۔ اس کا جواب مسلمانوں کی طرف سے یہ دیا جاتا تھا کہ ہم اپنی مذہبی زندگی اور اجتماعی زندگی کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کر سکتے، کیونکہ مذہب ہی ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مبداء اور اس کی اساس ہے۔ ہماری تہذیب میں مذہب صرف ایک عنصر کی حیثیت سے داخل نہیں بلکہ وہی اس تہذیب کا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے۔ اس لیے ہم مذہب کو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے خارج کر کے اپنی تہذیب کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ سیاسی، ملکی اور تمدنی امور میں مذہبی اندازِ فکر اور مذہبی طرزِ خیال سے ہٹ کر کسی دوسرے طریقِ فکر کے مطابق کام کریں، یا اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کر لیں جو ہمارے مذہبی

احساسات و تخیلات سے متاثر ہو۔ یہ جواب بالکل معقولیت پر مبنی اور اسلام کے مزاج اور تقاضوں کے عین مطابق تھا۔

حضرات! آپ خود ہی غور فرمائیں کہ جو ملک اسلام کی خاطر حاصل کیا گیا ہو اور جس کے قیام کا منتہائے مقصود ہی اسلامی تعلیمات کی عملی تعبیر ہو، اس ملک کے باشندوں کے بارے میں اب یہ سوچنا کہ انہیں کس تہذیب و تمدن کا خادم بنایا جائے، کس نوعیت کی امتیازی صفات سے انہیں متصف کیا جائے، کس نصب العین کو اُن کی سرگرمیوں کا ہدف ٹھہرایا جائے اور کس مقصد کے لیے انہیں سرگرمِ عمل اور متحرک کیا جائے، محض ایک لوالفضولی ہے۔ ان سارے امور کا فیصلہ تو ہم پہلے ہی کر چکے تھے اور اُسی فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے ہم نے جان و مال اور عزت و آبرو کے ناقابلِ بیان نقصانات برداشت کر کے ایک الگ خطۂ ارضی حاصل کیا تھا۔

حضرات! پاکستان مسلمانوں کے دینی احساسات کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہ اُن کی آرزوؤں کا مرکز، اُن کے عزائم اور ارادوں کا محور اور اُن کی امنگوں اور تمناؤں کا مظہر ہے۔ اسے صرف احیائے اسلام کے لیے قائم کیا گیا ہے اور اسی غرض کے لیے یہاں کے باشندے اس کے حفظ و بقا کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے پر آمادہ رہے ہیں۔ پاکستان ایک خطۂ ارضی ہی نہیں بلکہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی ایک انقلاب انگیز تحریکِ فکر و عمل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہاں دین صرف ایک محکمۂ اوقاف یا ایک شیخ الاسلامی یا ایک وزارتِ امورِ دینیہ کے قیام تک محدود نہ ہو بلکہ پوری اجتماعی زندگی، سیاست، معیشت، معاشرت، عدالت، قانون، تعلیم، غرض حیاتِ اجتماعی کے سارے گوشوں پر پوری طرح حاوی ہو۔

پاکستان کے اس پس منظر اور اس کے ساتھ وابستہ اِن جذبات و احساسات کو اگر سامنے رکھا جائے تو پاکستان کے مطلوب شہری کے اوصاف کا تعین کچھ مشکل نہیں رہتا۔ پاکستان کا مطلوب شہری وہی ہو سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات کا امین اور علمبردار ہو۔ اس ملک کو جس

مقصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا اس کے شہریوں کی توجہ لازماً اسی مقصد کے حصول پر مرکوز ہونی چاہیے۔ اسلام کے ساتھ سچی محبت و وابستگی، اس کی سربلندی کا مخلصانہ جذبہ اور اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنانے کی گہری لگن ایک پاکستانی کے امتیازی اوصاف ہونے چاہییں۔ اگر وہ اِن مقاصد کو نظر انداز کر کے اور بعض دوسرے مقاصد کے حصول اور بعض دوسرے اوصاف کو اپنانے کے لیے تگ و دو کرتا ہے تو یہ پاکستان کے اساسی تصور کے خلاف صریح بغاوت ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم پاکستان کے یہ مطلوب شہری پیدا کر سکتا ہے؟

ظاہر بات ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم، جو دراصل انگریز کے لیے چند مفید مطلب کارکن پیدا کرنے کے لیے مرتب کیا گیا تھا، اور جس کے پیشِ نظر ہندوستانیوں کی ایک ایسی کھیپ تیار کرنا تھا جو خون کے اعتبار سے تو بلاشبہ ہندوستانی ہو مگر فکر و نظر اور جذبات و احساسات کے لحاظ سے خالص فرنگی ہو۔ پاکستان کے اِن تقاضوں کو کسی اعتبار سے بھی پورا نہیں کر سکتا۔ مروجہ نظامِ تعلیم میں تعلیم کا مقصد اکبر الٰہ آبادی کے الفاظ میں بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ؏

بی، اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

موجودہ نظامِ تعلیم نے ہماری نوخیز نسلوں کو اسی لیے کسی بلند تر مقصد سے آشنا نہیں کیا۔ اس مجلس میں کئی نامور اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم موجود ہیں۔ اِن سے دریافت کیجیے تو وہ آپ کو خود بتا دیں گے کہ آج کل کا طالب علم اپنے سامنے کوئی اونچا اور بلند مقصد نہیں رکھتا۔ اس کی تگ و دو کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ کسی طرح امتحانات پاس کر لیے جائیں اور پھر ان ڈگریوں کی مدد سے کوئی ایسی ملازمت تلاش کر لی جائے جو اُسے اقتدار اور خوشحالی سے بہرہ مند کر دے۔

اب اگر ہم واقعی اس ملک کی نوخیز نسلوں کو اسلام کا شیدائی بنانے کا عزم رکھتے ہیں تو

ہمیں یہ بات پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ کام محض نصاب کی ترتیب میں چند مضامین کے تغیر و تبدل سے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اس ملک کے حاکم و محکوم اسلام کے معاملے میں یکسو ہوں اور وہ اس منافقانہ طرزِ عمل کو خیرباد کہنے کے لیے تیار ہو جائیں جو انہوں نے دین کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ اُس نے اپنے دین کی خدمت کے لیے معاشرے کے کمزور طبقوں، چرواہوں، مچھیروں اور غلاموں تک سے کام لیا ہے لیکن منافقوں اور آبرو باختہ لوگوں سے اس کو ہمیشہ بچایا ہے۔ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ آج نہ صرف اس ملک میں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں دینِ حق کے ساتھ جو شرمناک مذاق کیا جا رہا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے نوخیز نسلیں اسلام سے کس طرح متاثر ہو سکتی ہیں۔ الناس علیٰ دین ملوکہم ایک ایسی ہمہ گیر سچّائی ہے جس کی صحت ہر دور میں تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ جن لوگوں پر اسلامی نظام کے قیام کی براہ راست ذمّہ داری عائد ہوتی ہے، جب وہ خود ہی دین کے ساتھ مذاق کر رہے ہوں تو نوجوان اُسے آخر کس طرح سنجیدگی سے اپنا سکتے ہیں۔ وہ بیچارے ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے دین کو بازیچۂ اطفال بنتے دیکھتے ہیں۔ اُن کے کانوں میں برسرِ اقتدار طبقوں کی اسلام سے گہری وابستگی اس کے ساتھ گہری عقیدت کی داستانیں پڑتی ہیں۔ وہ ان حضرات کی زبان فیض ترجمان سے آئے دن یہ سنتے رہتے ہیں کہ اسلام ہی ہماری اور پوری نوعِ انسانی کی مشکلات کا واحد حل ہے اور اسی میں انسانیت کی فوز و فلاح کا راز مضمر ہے۔ یہ باتیں سن سُن کر نوجوان نسلوں کے اندر اسلام کے متعلق کچھ اچھے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر جب وہ اسلام کی محبت کا دم بھرنے والے انہی لوگوں کا رویّہ دنیائے عمل میں دیکھتے ہیں، تو انہیں یہ سبق ملتا ہے کہ اسلام صرف باتیں بنانے کے لیے ہے، عمل کے لیے نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کوئی رنگین غبارہ ہے جسے ہماری قوم کے بڑے لوگ اپنے عوام کا دل بہلانے کے لیے اڑایا کرتے ہیں۔ اُن کے دل و دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ یہ دین اس قوم کی قوت و طاقت کا سرچشمہ نہیں بلکہ اُس کی

کمزوری ہے جس سے بوقتِ ضرورت فائدہ اٹھانے کے کسی موقع کو تو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیے مگر عمل کی دنیا میں اس کی ہدایات اور پابندیوں سے ہر طرح گریز کرنا چاہیے۔ دو رنگی اور تضاد کی اس فضا میں آخر کس طرح نوخیز نسلوں کو اسلام کا علمبردار بنایا جا سکتا ہے چنانچہ اس ماحول میں ہماری جو نوجوان نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں وہ بھی دین کو بس ایک کھلونے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتیں۔ جب کسی مجلس کو گرمانے یا کوئی مؤثر بیان دے کر عوام کے جذبات سے کھیلنے کی ضرورت پیش آئی تو فوراً اس کو استعمال کر لیا لیکن جہاں اس دینِ حق نے کسی معمولی سے معمولی ایثار کا مطالبہ کیا وہاں اس سے اس طرح آنکھیں چرا کر نکل گئے جیسے کہ اُن کا اللہ کے اِس دین سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

اس ماحول میں جو سوسائٹی تشکیل پا رہی ہے وہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے بڑی کمزور اور بودی ہے۔ آپ خود حالات کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ موجودہ معاشرے میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو اپنا کوئی ضمیر رکھتے ہیں اور پھر اس ضمیر کے مطابق عمل کرنے کا عزم اور حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ مکر، فریب، ریاء، بے اصولی، خوشامد ہماری قومی زندگی کی خصوصیات بن چکی ہیں۔ چند مقدس مستثنیات کو چھوڑ کر ہر فرد جائز و ناجائز طریق سے دولت اور اقتدار حاصل کرنے کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ جب انسان چشمِ تصور میں حالات پر نگاہ ڈالتا ہے تو یوں نظر آتا ہے کہ ضمیر فروشوں کے ٹولے اپنی متاعِ ایمان کا سودا کرنے کے لیے گاہکوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کوئی بے جان سکّوں کے عوض اسے بیچنے کے لیے تیار ہے، کوئی کسی اونچے عہدے کے لالچ میں اسے فروخت کرنے پر تلا ہوا ہے، اور کوئی حکمرانوں کی چشمِ التفات پر اسے بطور نذرانہ پیش کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ ہر شخص نے اپنی جگہ اس مال کی ایک قیمت تجویز کر رکھی ہے اور جب وہ قیمت مل جاتی ہے تو بلا تامل وہ اسے بیچ ڈالتا ہے۔ ایسا معاشرہ نوجوان کو کسی نصب العین کا علمبردار کس طرح بنا سکتا ہے۔

حضرات! کسی نصب العین سے ایک انسان کو کس قدر وابستگی اور محبت ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اس کا ایک ہی معیار ہے کہ انسان جس مقصد کو اپنانے کا دعویدار ہے اس کے لیے وہ کتنا ایثار کر سکتا ہے۔ سب سے پہلے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسی بنیادی عبادات کو ہی لیجیے جنہیں اسلام اولین اہمیت دیتا ہے۔ آپ کو ایک نہایت قلیل تعداد صحیح معنوں میں اُن کی پابند نظر آئے گی۔ اسلام کی اخلاقی اقدار کے متعلق بھی ہمارے ہاں ایک عام لاپروائی بلکہ بغاوت کا رجحان نظر آتا ہے، خصوصاً صنعت و تجارت میں معمولی معمولی فوائد کی خاطر بڑی بے تکلفی کے ساتھ جھوٹ اور فریب سے کام نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سرکاری دفاتر میں شاید ہی چند خوش نصیب افراد ایسے ہوں جو رشوت ملنے کے باوجود محض اللہ کے خوف سے اس حرام خوری سے بچنے کی کوشش کرتے ہوں۔ ہماری سوسائٹی کے اندر جو عام اخلاقی انحطاط پایا جاتا ہے وہ تو خیر اپنی جگہ بڑا تشویشناک ہے ہی، لیکن اس کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ ہے کہ خود دیندار طبقوں کے اندر بھی "امورِ دنیا" کے معاملے میں وہ اخلاقی احساس باقی نہیں رہا جو ان کی اسلام سے سچی وابستگی ظاہر کر سکے۔ یہ حضرات خواہ زبان سے یہ کہتے رہیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے لیکن عملی میدان میں، اسلام ان کے نزدیک ایک خالص روحانی وظیفہ ہے جس کا انسان کی معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے دیندار طبقوں کا یہ رویہ اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ اسلام زندگی کی غایتِ اولیٰ نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کے متعدد شعبوں میں صرف ایک شعبہ ہے جس کا زندگی کے دوسرے گوشوں سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔

جس معاشرے میں بنیادی مقصدِ حیات کے ساتھ عوام کی وابستگی کے یہ انداز ہوں اس معاشرے کی نوخیز نسلوں کو اسلام کا علمبردار بنانا حکایت تشنہ و سراب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ایک بچے کو ماحول سے یکسر الگ کر کے کس طرح تربیت دی جا سکتی ہے وہ قدم قدم پر اسلام کے بارے میں دورنگی اور منافقت کے رُوح فرسا مناظر دیکھتا ہے

اور بالآخر یہ نقش خود بخود اس کے دل و دماغ میں بیٹھ جاتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں کوئی انقلاب انگیز تحریک فکر و عمل ہو تو ہو لیکن دورِ جدید میں یہ ہر لحاظ سے ناقابلِ عمل ہے۔ اب اس کی اگر کوئی افادیت باقی ہے تو صرف اسی قدر کہ یا تو بوقتِ ضرورت اس کا نام لیکر عوام کو بہکایا جائے یا اس سے کبھی کبھی اپنے روحانی احساس کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا جائے۔

بچہ جب ان احساسات کے ساتھ کسی درسگاہ کا رخ کرتا ہے تو وہاں کا ماحول انہیں مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ تعلیم گاہ کی پوری فضا میں اسلام سے گریز کے واضح رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اساتذہ کے لباس، بول چال، چال ڈھال، اخلاق و اعمال، ان کا جذبۂ نمائش، ذرا ذرا سی باتوں پر ان کی آپس کی شکر رنجیاں، اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان کا تغافل، دولت کے حصول کے لیے ناجائز طریقوں کا استعمال، امتحانات میں بد دیانتی، یہ وہ عام بیماریاں ہیں جو قریب قریب ہر تعلیمی ادارے میں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج استاد کا وہ احترام اور اس کے ارفع و اعلیٰ پیشے کی وہ تقدیس باقی نہیں رہی جو معلمِ اخلاق ہونے کی وجہ سے کبھی اُسے حاصل تھی۔

پھر جماعتوں میں وہ جو صورتِ حال دیکھتا ہے اُس سے اُسے اسلام کے بارے میں اور بھی بے یقینی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب وہ معاشیات کا سبق پڑھنے کے لیے استاد کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو وہ یہ سنتا ہے کہ معاشیات کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ روحانی، مذہبی اور اخلاقی بندشیں معاشی ترقی کے لیے روگ ہیں۔ روزہ سے استعدادِ کار کم ہوتی ہے۔ نماز اوقاتِ کار کا اچھا خاصا حصہ ضائع کر دیتی ہے۔ حج سے زرِ مبادلہ کا نقصان ہوتا ہے مساجد کی تعمیر سے زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے بیکار ہو جاتے ہیں۔ زکوٰۃ ایک رجعت پسندانہ اور غیر عادلانہ ٹیکس ہے جس میں بنیادی تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ سُود کے بغیر معاشی ترقی ممکن ہی نہیں ہے۔ سٹے کے ذریعہ ہی قیمتوں میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

نفسیات میں ایک بچے کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ خدا، نبوت، وحی، الہام، حشر و نشر یہ سب اوہام ہیں جو تاریکی میں انسان کے دل و دماغ کے اندر خود بخود پلتے رہتے ہیں۔ نیکی و بدی

سب اضافی و اعتباری باتیں ہیں۔ جنسی لذات کی تسکین میں کسی نوعیت کی قدغن انسان کو مختلف قسم کی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے اس لیے انسان کو ان بندشوں سے آزاد رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

فلسفہ اور نفسیات کا دورِ جدید میں جس نہج پر ارتقاء ہوا ہے۔ اس کا مطالعہ ایک نوجوان کو، جو اپنے اندر نا قدانہ صلاحیتیں نہ رکھنے کی وجہ سے غلط اور صحیح کے درمیان اچھی طرح امتیاز نہیں کر سکتا، مذہب کا باغی بنا دیتا ہے۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں کیا جاتا ہے کہ خدا کا تصور دراصل طبیعی قوتوں کے ہاتھ میں انسان کی بے بسی کا نتیجہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام معاذ اللہ بعض نفسیاتی بیماریوں کے زیر اثر ماورائی باتیں کر دیا کرتے تھے جنہیں انجان لوگوں نے وحی و الہام مان کر سینے سے لگا لیا۔

ان گمراہ کن افکار و نظریات نے ادب کو بھی بڑی حد تک مسموم بنا دیا ہے۔ دورِ جدید کا ادب پڑھ کر انسان کے اندر اس

دیکھے بھالے، بن سوچے، جانے پہچانے، بن بوجھے

وجود کا احساس، جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے، پختہ ہونے کی بجائے مضمحل ہوتا ہے اور انسان اُسے بدیہی حقیقت سمجھنے کے بجائے محض اپنی ذاتی کیفیات کا پرتو سمجھنے لگتا ہے۔

اور تو اور، مناظرِ فطرت جو انسان کے اندر ایمانی کیفیت پیدا کرنے میں ہمیشہ ممد و معاون رہے ہیں، آج انہیں بھی باری تعالیٰ کے وجود کے انکار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور نوجوانوں کے ذہنوں میں اس باطل خیال کی آبیاری کی جاتی ہے کہ فطرت کا یہ جمال کسی حسنِ ازل کی جھلک نہیں بلکہ اندھے، بہرے مادہ کی کرشمہ سازی ہے۔

اس غیر اسلامی معاشرت، درسگاہوں کے غیر اسلامی ماحول اور نصاب کے غیر اسلامی مزاج کے ہوتے ہوئے نوخیز نسلوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ اسلام کی علمبردار بن کر دنیا میں سرگرم

عمل ہونگی محض خود فریبی ہے۔ اگر ہم واقعی اپنی آنے والی نسلوں کو اسلام کا خادم بنانے کے متمنی ہیں تو پھر ہمیں سب سے پہلے اسلام کے بارے میں اپنے فکر و نظر کے زاویوں اور اپنی عقیدت و محبت کے انداز کو بدلنا چاہیے۔ ہم جب تک اسلام کے معاملے میں یکسو نہیں ہو جاتے اور اسے اپنی زندگی کی غایت الغایات ٹھہرا کر اس کی پیروی کا ارادہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں کر لیتے اس وقت تک ہماری نوخیز نسلیں منافقت کی اس بیماری سے نجات نہیں پا سکتیں جو ہمارا پورا ماحول انہیں لگا رہا ہے۔

اس کے بعد درسگاہوں کے ماحول کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے اور اس کے لیے ہمیں سب سے پہلی تبدیلی یہ کرنی ہوگی کہ مخلوط تعلیم کی بساط کو جلد از جلد لپیٹ دیا جائے۔ یہ چیز اسلام کے نظامِ معاشرت اور اخلاقی اقدار کے خلاف ایک کھُلا چیلنج ہے جسے کوئی مسلمان قوم ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتی اگر اس کے اندر اپنے مسلمان ہونے کا کچھ بھی شعور باقی ہو۔

اس کے علاوہ نصابِ تعلیم میں بھی بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں ابتدا ہی میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ محض چند مضامین کے تغیّر و تبدل سے نوخیز نسلیں اسلامی سانچوں میں نہیں ڈھل سکتیں۔ ہمیں لازماً سارے علوم و فنون کو اسلام کے اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنا پڑے گا۔ مغربی علوم کو جوں کا توں اپنا کر ان کے ساتھ اسلامیات کے چند اسباق کو الگ سے شامل کر لینا تعلیمی نقطۂ نظر سے کوئی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس ملغوبے سے طلبہ کی تخلیقی صلاحیتیں اُبھرنے کے بجائے اُن کے ذہنوں میں انتشار پیدا ہوگا۔

نظامِ تعلیم کے متعلق کوئی بحث بھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ زبان کا ذکر نہ کیا جائے۔ جس طرح بعض مسلمان مغربی علوم و فنون کے متعلق اس غلط فہمی میں گرفتار ہیں کہ یہ محض حقائق کی پردہ کشائی ہے اور ان سے صرف ذہنی افق ہی وسیع ہوتا ہے، اسی طرح زبان کے مسئلے کو بھی یہ حضرات محض ایک ادبی مسئلہ سمجھتے ہیں جس کا کوئی تعلق، کم از کم کوئی خاص تعلق کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے جس میں کوئی شخص مبتلا

ہو سکتا ہے۔ کسی قوم کی زبان اُس کے افراد کے درمیان محض اظہارِ خیال کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ وہ زبردست قوت ہے جس سے احساسات و جذبات کی ساری منتشر طاقتیں شخصیت کی گہرائیوں میں سموئی جاتی ہیں۔ اس سے ہمارے اندر ایک خاص ذہنی میلان پرورش پاتا ہے جو بالآخر ایک خاص طرزِ فکر اور ایک خاص سیرت و کردار پر منتج ہوتا ہے۔ اس کی وساطت سے ایک قوم اپنے ماضی اور اس کی تاریخی روایات سے وابستہ رہتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر قومیت کے بنانے اور بگاڑنے میں، تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کرنے میں، قومیت کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں زبان کا اثر غیر معمولی ہوتا ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے وہ ایک مستقل قوم ہے اور جو قوم غیروں کی زبان سے اپنے احساسات و افکار ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتی ہو اور اسے اپنا شعار بنانے کی آرزومند ہو، وہ ہمیشہ ذہنی غلامی میں مبتلا رہتی ہے اور جسم کی آزادی اُس کے کچھ کام نہیں آتی۔ اُس کے افراد کی تخلیقی قوتیں کبھی پروان نہیں چڑھتیں اور وہ دنیا میں ایک آزاد، باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے بجائے دوسری قوموں کی تابعِ مہمل بن کر زندگی بسر کرتی ہے۔

مطبوعات

تاویل الاحادیث تالیف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ۔ شاہ ولی اللہ اکاڈیمی۔ حیدرآباد (سندھ)۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ۳ روپے۔

یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور اس میں حضرت شاہ صاحب نے قصص الانبیاء کے رموز اور ان کی توجیہ پر کلام فرمایا ہے۔ ایک زمانہ میں یہ دہلی سے شائع ہوئی تھی، مگر مدت دراز سے نایاب تھی۔ اب استاذ غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب نے تحقیق و تنقیح کے ساتھ مرتب کر کے اسے شاہ ولی اللہ اکاڈیمی سے شائع کیا ہے اور شروع میں اس پر ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کتاب میں حضرت آدم سے لیکر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کے قصوں پر بحث کی ہے اور ان کے غیر معمولی حالات و معجزات کی توجیہات فرمائی ہیں۔ کتاب کس پایہ کی ہے؟ اس کے لیے جلیل القدر مصنف کا اسم گرامی ہی کافی ہے۔ البتہ بعض مقامات پر ان کی توجیہات دل میں سخت کھٹک پیدا کرتی ہیں، مثلاً صفحہ ۷۳۔۷۴، پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے باپ پیدا ہونے کی توجیہ۔

موضح القراآت فی السبع المتواترات تالیف مولانا قاری محمد حبیب اللہ خاں صاحب مدرسہ تجوید القرآن، فاروقی مسجد، میری ویدر ٹاور، کراچی ع۲۔ قیمت تین روپیہ۔

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے سات متواتر قرأتوں کے مطابق قرآن مجید کا پہلا پارہ اس طرح مرتب کیا ہے کہ جہاں جہاں ان قرأتوں میں اختلافات ہیں ان کو بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ آغاز میں اُن قرّاد سبعہ کے حالات مختصراً تحریر کر دیئے ہیں جن سے یہ قرأتیں منقول ہیں۔

اس کے ساتھ تجوید کے وہ ضروری قواعد بھی درج کر دیئے ہیں جن کو جانے بغیر آدمی ان قرأتوں کے فرق کو نہیں سمجھ سکتا۔ تجوید کے شائقین کے لیے یہ ایک بہت مفید چیز ہے۔

قُراءِ سبعہ کے حالات کو صاحبِ موصوف نے ایک الگ رسالے کی شکل میں بھی شائع کیا ہے جو مذکورہ بالا پتے پر ۵۰ پیسے میں مل سکتا ہے۔

تذکرۂ افریقیہ | تالیف بریگیڈیر گلزار احمد صاحب، ضخامت ۲۰۰ صفحات مجلد، معارف لمیٹڈ جی پی او بکس ۲۲، کراچی، قیمت دس روپے۔

۱۹۶۰ء میں جب افریقیہ کے نئے نئے ممالک آزاد ہونے شروع ہوئے تھے اس وقت حکومت پاکستان نے ایک وفد ان کو خیر سگالی کا پیغام پہنچانے اور ان کے جشنِ آزادی میں شریک ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ کتاب کے مصنف، بریگیڈیر گلزار احمد صاحب بھی اس کے ایک رکن تھے۔ واپسی پر انہوں نے اپنا سفرنامہ مرتب کیا اور کتابی صورت میں اسے شائع کرا دیا۔ یہ ایک نہایت دلچسپ اور مفید معلومات پر مشتمل کتاب ہے اور افریقیہ کے حالات و مسائل کو سمجھنے میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ سفر اگرچہ رواں دواں تھا اور تین مہینے میں ۱۸-۱۹ ملکوں کا دورہ کیا گیا تھا، مگر اس کے باوجود فاضل مصنف نے بڑی بالغ نظری کے ساتھ ان ملکوں کے دینی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کا مشاہدہ کیا ہے اور بڑے اچھے انداز میں ان کو بیان کیا ہے۔ پھر مزید خوبی یہ ہے کہ وہ ایک دردمند مسلمان ہیں اس لیے انہوں نے نہایت گہرے اسلامی جذبات کے ساتھ افریقیہ کے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ استعماری طاقتوں نے ان کے ساتھ کیسی کیسی بے انصافیاں کی ہیں۔

معاشی اور تعلیمی اور سیاسی حیثیت سے ان کو کس طرح گرا کر رکھا گیا ہے، قادیانی مشن وہاں کیا فتنے برپا کر رہے ہیں، دین دار مسلمانوں نے وہاں کیسے سخت حالات میں اپنے دین و ایمان کی

حفاظت کی ہے، اور اسلام کس طرح محض اپنے اصولوں کی طاقت سے انتہائی نامساعد حالات میں بھی پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ایک بڑی سبق آموز اور مفید کتاب ہے جسے ہمارے ذی فہم لوگوں کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

THE KASHMIR SAGA تالیف سردار محمد ابراہیم خاں صاحب سابق صدر آزاد کشمیر۔ ضخامت ۲۲۸ صفحات مجلد قیمت ۱۰ روپے مصنف سے ۲۸-ڈی (۱)، گلبرگ ۳، لاہور کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے کشمیر کی تحریک آزادی کی پوری تاریخ بیان کی ہے اور ۱۹۴۷ء سے اب تک کشمیر کا مقدمہ جن جن مراحل سے گزرا ہے ان کی تمام ضروری تفصیلات درج کی ہیں۔ مسئلۂ کشمیر کے متعلق اس قدر مفصل اور مستند معلومات ہمارے علم کی حد تک کسی دوسری کتاب میں یکجا نہیں مل سکتیں۔

حیاتِ فخر تالیف مشتاق احمد خاں صاحب ضخامت ۲۸۸ صفحات مجلد قیمت ۳ روپے پچاس پیسے ملنے کا پتہ: شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی، ۱۸-رام گلی نمبر ۳، لاہور

اس کتاب میں مؤلف نے اپنے والد بزرگوار نواب فخر یار جنگ مرحوم سابق وزیر مالیات ریاست حیدر آباد دکن کے حالات لکھے ہیں۔ نواب صاحب مرحوم حیدر آباد میں ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۰ء تک مسلسل ۲۷ سال اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں وزیر مالیات کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اس پوری مدت میں انہوں نے دیانت، امانت، فرض شناسی، اصول و ضابطہ کی پابندی اور سیرت کی مضبوطی کا نہایت بلند نمونہ پیش کیا جس کی شہادت ہر وہ شخص دے گا جو اس زمانے میں حیدر آباد کے حالات سے واقف رہا ہے۔ درحقیقت وہ اپنے زمانے میں اُن روایات کے بہترین وارث تھے جو ان سے پہلے حیدر آباد میں نواب وقار الملک مرحوم نے قائم کی تھیں۔ ان کے لائق فرزند نے ان کی زندگی کے سبق آموز حالات شائع کر کے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے۔

میر و سودا کا دور تالیف۔ جناب ثناء الحق صاحب ایم، اے علیگ۔ شائع کردہ: ادارہ تحقیق و

تصنیف ۱۴۱/۱ وحید آباد، کراچی نمبر ۸ قیمت ۱۲ روپے صفحات ۴۹۲

شاعری درحقیقت کسی دل حساس کے تاثرات کا نغمگی کی کیفیت میں اور موزون و مترنم الفاظ کی صورت میں دل گداز اور مُوثر اظہار ہے۔ ان تاثرات کا منبع و مخزن بلاشبہ شاعر کا دل ہوتا ہے لیکن اس کے تاروں میں خارجی واقعات و حوادث ہی ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ اس بنا پر کسی دَور کے ادب کو سمجھنے کے لیے اُس دَور کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی ماحول کا مطالعہ بھی اشد ضروری ہے۔

میر و سودا کا دَور نادر شاہ کے حملے یعنی ۱۷۳۹ء کے بعد شروع ہُوا اور میر تقی میر کی وفات یعنی ۱۸۱۵ء میں ختم ہُوا۔ یہ دَور انتہائی پُر آشوب تھا اسی لیے اس دَور کی شاعری میں ہمیں یاس و قنوطیت، محرومی اور حرمان نصیبی کے احساسات ملتے ہیں۔ میر و سودا کے کلام میں قدم قدم پر شکستگی کا احساس ہوتا ہے لیکن اس احساس میں بھی نئی شان، نئے انداز اور نئے تیور پیدا کیے ہیں اور غمِ عشق اور غمِ زندگی دونوں کو زندہ رہنے اور مقابلہ کرنے کا تازہ دم حوصلہ عطا کیا ہے خصوصًا میر نے غم کو نہ صرف ایک مقدر کی طرح تسلیم کیا بلکہ غم کو زندگی کی حیات آفریں قوت میں تبدیل کیا اور آلام کو عارفانہ تیور اور بے نیازانہ وضع کے ساتھ برداشت کرنے کی تلقین کی۔

فاضل مصنف نے اس تصنیف میں میر و سودا کے دَور کے سیاسی اور معاشرتی پس منظر کا بڑی دیدہ وری سے جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب ادب کے طلبا کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ معیارِ کتابت و طباعت عمدہ ہے۔

اردو ڈائجسٹ | زیرِ ادارت جناب الطاف حسین قریشی۔ قیمت ڈھائی روپے صفحات ۲۲۰۔

یہ مشہور ماہنامہ گذشتہ چھ سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اس نے بڑی سرعت کے ساتھ اردو ادب اور صحافت میں ایک نمایاں مقام پیدا کیا ہے۔ مضامین میں تنوع، اندازِ بیان میں شگفتگی اور زندگی کے روزمرہ مسائل کے بارے میں مفید معلومات کی فراہمی کی وجہ

سے یہ مجلہ ہر طبقۂ خیال میں مقبول ہوا ہے۔ زیرِ تبصرہ شمارہ (جون ۱۹۶۶ء) اس کا سالنامہ ہے جسے بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں تین مقالات، ذوالفقار علی بھٹو، سابق وزیرِ خارجہ پاکستان، مسکراتے گوشے اور کیانی مرحوم کے خطوط خاص طور پر معلومات افزا اور دلچسپ ہیں۔

ایک بات البتہ ہمیں اس کے عام شماروں کی طرح اس میں بھی کھٹکتی ہے۔ اور وہ اشتہارات کی بعض ایسی تصاویر ہیں، جو اس مجلہ کے اسلامی اور تعمیری رجحانات سے ہم آہنگ نظر نہیں آتیں۔ معیارِ طباعت اور کتابت اتنا بلند ہے کہ اسے مغربی رسائل کے مقابلے میں بآسانی پیش کیا جا سکتا ہے۔

مجموعہ قوانینِ اسلام۔ جلد اول | تالیف: جناب تنزیل الرحمٰن ایم، اے، ایل، ایل، بی۔
شائع کردہ: مرکزی ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی پاکستان (کراچی) قیمت دس روپے صفحات ۳۲۸۔

یہ فاضلانہ تصنیف ممتاز قانون دان جناب تنزیل الرحمٰن کی غیر معمولی کاوش اور عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں قانونِ ازدواج کے تحت نکاح، مہر اور نفقہ کے ہر مسئلہ کو بڑی خوبی کے ساتھ قانون کی زبان میں قلمبند فرمایا ہے اور اس ضمن میں قدما سے لیکر آج تک کے مفکرین کی آرا کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اور ان کے خیالات میں جہاں کہیں کوئی الجھاؤ محسوس کیا ہے اُسے قرآن و سنت کی روشنی میں سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف سے فقہ کا ایک ایسا قابلِ قدر ورثہ ملا ہے جس کی نظیر دنیا کی کسی دوسری قوم میں نہیں ملتی لیکن چونکہ اس کا انداز موجودہ زمانے کے مجموعۂ قوانین سے مختلف ہے اس لیے ہمارے قانون دان اس فقہی سرمایہ سے کماحقہٗ استفادہ نہیں کر سکتے اور غیر مسلموں کی لکھی ہوئی کتب پر مجبوراً اعتماد کرتے ہیں۔ ظاہر بات ہے یہ کتب اسلامی تعلیمات اور ان کی روح کی صحیح طور پر ترجمانی نہیں کر سکتیں۔ اس خلا کو پورا کرنے میں زیرِ تبصرہ کتاب نہایت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

فاضل مصنف کا مطالعہ بڑا وسیع، ذہن بڑا رسا ہے البتہ اجتہاد کے ذیل میں کہیں کہیں تجدد پسندی کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔

کتابت دبیز کاغذ پر، نہایت موزوں ٹائپ میں نہایت اچھے معیار پر طبع ہوتی ہے۔
سرورق دیدہ زیب ہے۔

بقیہ اشارات

استقبال	۵,۷۶۔۹۷
ٹیلیفون	۱۱۸۔۷۸
طلباء کو مالی امداد	۳,۶۵۷۔۸۹
کپڑوں کی دھلائی اور جوتوں کی مرمّت	۲,۶۳۸۔۸
لاہور کے جنگی بے گھروں کے لیے	۲۱,۱۰۰۔۰۰
طبی یونٹس پر خرچ	۷۵,۵۱۱۔۰۳
جبیب بنک (بقایا محفوظ)	۱۹,۰۴۴۔۸۵
نقدی کی صورت میں اپنے پاس	۱,۱۸۸۔۴۴

مجموعی خرچ	=	۲,۹۵,۱۶۹۔۶۸